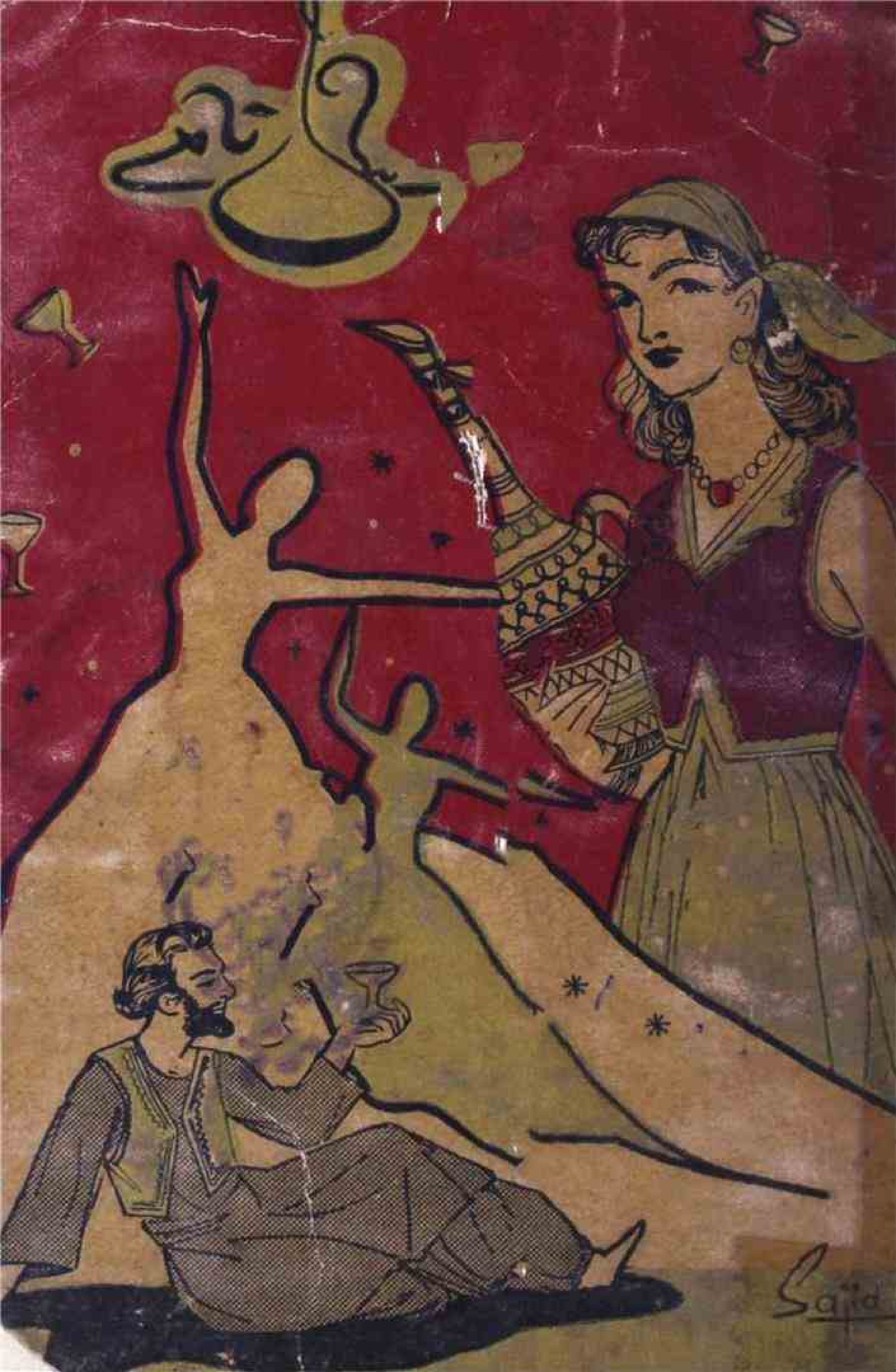
Sajid

چمن سیریز پاکٹ بک نمبر ۹

ساقی نامے

(مشہور شاعروں کے منتخب ساقی نامے)

انور کمال حسینی

ناشر :۔ انوری چمن
آرٹسٹ :۔ بی اے ساجد
کاتب :۔ ابوالبرکات گونڈوی

تقسیم کار

ادارہ چمن سیریز ۔ ۶۳۰ مٹیا محل ۔ دہلی ۔ ۶

عرضِ مرتّب

"روحِ غزل" کے بعد "ساقی ناموں" کا انتخاب حاضرِ خدمت ہے کیسا ہے؟
اس کا فیصلہ مجھ سے بہتر آپ کر سکتے ہیں، میں تو صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ انتہائی کاوش و محنت سے میں نے یہ انتخاب کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ اردو کے منتخب شعراء کے نمائندہ ساقی نامے اس انتخاب میں شامل ہو جائیں اس انتخاب میں آپ کو صرف "ساقی ناموں" کے ساتھ ساتھ "ساقی" ردیف میں غزلیں بھی ملیں گی جو ساقی ناموں میں بھی یقیناً نمائندہ کہی جا سکتی ہیں!

اردو شاعری میں ساقی و رند، بڑی خصوصیت کے حامل ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ان ساقی ناموں میں شاعر نے اپنے زورِ ادا اپنے ذہن کی بہت عمدہ عکاسی کی ہے اور آپ دیکھیں گے کہ بڑی بڑی باتیں ساقی و رند کے کردار میں بیان کر دی گئی ہیں روحانی حیثیت میں بھی ساقی و رند اپنے اندر بہت کشش رکھتے ہیں!

اس سیریز کی تیسری شعر و شاعری کی کتاب "نظمیں" ہے جس میں اردو کے نمائندہ نظم گو شعراء کی منتخب منظومات یکجا کی گئی ہیں ۔۔۔۔ توقع ہے کہ ارباب ذوق اس کی پذیرائی کریں گے!

رائے کا منتظر
(انور کمال حسینی)

۳۷۷۲، کوچہ چیلان دہلی

۷ر فروری ۱۹۶۳ء

موجودہ مطبوعات

۱	مظلوم قاتل	عارف مارہروی	۱۔۵۵
۲	زمانہ کیا کہے گا	راحیلہ بانو	۱۔۵۵
۳	روحِ غزل	مرتبہ انور کمال حسینی	۱۔۵۵
۴	انوکھی دشمنی	عارف مارہروی	۱۔۵۵
۵	آندھیاں	انیس مرزا	۱۔۵۵
۶	ساقی نامے	انور کمال حسینی	۱۔۵۵

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

جو بادہ کش تھے پرانے اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی

کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری
سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی

(اقبالؔ)

کہاں سے بڑھ کے پہنچے ہیں کہاں تک علم و فن ساقی
مگر آسودہ انساں کا نہ تن ساقی نہ من ساقی

یہ سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی
خدا حافظ چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی

سلامت تو، ترا میخانہ، تیری انجمن ساقی!
مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی

رگ و پے میں کبھی صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی
مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موجزن ساقی

کبھی میں تھا شاہد در بغل، توبہ شکن مے کش!
مگر بننا ہے اب خنجر بکف، ساغر شکن ساقی

نہ لاؤ سوا اس دل میں، جو ہیں تیرے دیکھنے والے
سرِ مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی

جو دشمن کے لئے بھی سر سے اپنے کھیل جاتے ہیں
دلِ خوباں میں چھپتا ہے انہیں کا بانکپن ساقی

ترے جوشِ رقابت کا تقاضا کچھ بھی ہو، لیکن
تجھے لازم نہیں ہے ترکِ منصب دفعتاً ساقی

ابھی ناقص ہے معیارِ جنوں، تنظیمِ مے خانہ!
ابھی نامعتبر ہے تیرے مستوں کا چلن ساقی

وہی انسان جسے سر تاجِ مخلوق ہونا تھا
وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

لباسِ حریت کے اڑ رہے ہیں ہر طرف پرزے
بساطِ آدمیت ہے شکن اندر شکن ساقی

مجھے ڈر ہے کہ اس ناپاک تر دورِ سیاسی میں
بگڑ جائے نہ خود میرا مذاقِ شعر و فن ساقی

کہیں ملحد نہ بن جائیں مرے افکارِ سنجیدہ
کہیں مرتد نہ ہو جائے مرا ذوقِ سخن ساقی

کہیں خود حسن رہ جائے نہ قومی ملکیت بن کر!
کہیں خود عشق ہو جائے نہ محدودِ وطن ساقی

کہاں ہیں رندِ سرگشتہ، کہاں یہ نخوتِ تمکیں
سمجھ لے اس کو بھی میرا اک اندازِ سخن ساقی

عجب کیا ہے یہ بہکی بہکی باتیں رنگ لے آئیں
بہت باہوش رہتا ہے مرا دیوانہ پن ساقی

نمودِ صبح کاذب ہی دلیل صبحِ صادق ہے!
اُفق سے زندگی کی دیکھ وہ ابھری کرن ساقی

بدہ جامِ مئے رنگیں کہ در جنت نخواہی یافت
سوادِ ساحلِ گنگا و گلگشتِ چمن ساقی

(جگرؔ مرادآبادی)

ترے رندوں کو راس آئی نہ صہبائے کہن ساقی
کہ ہے بہکی ہوئی سی انجمن کی انجمن ساقی
نہیں معلوم یہ بدمستیاں کیا رنگ لائیں گی
کہاں تک اور بگڑے گا ابھی ان کا چلن ساقی
نہیں ہیں جو ابھی تو نے امانت ان کو سونپی ہے
یہ وہ رہبر ہیں جن سے کانپتے ہیں راہزن ساقی
دل آزاری ستم رانی کی کوئی انتہا بھی ہے
ستائیں گے کہاں تک مجھ کو اپنائے وطن ساقی
تخیل میں کچھ اپنے حشر کے آثار پاتا ہوں
مری خلوت ہوئی جاتی ہے اب تو انجمن ساقی
یہاں جنسِ وفا کا اب کوئی گاہک نہیں ملتا
بھلا بیٹھے ہیں سب اپنی روایاتِ کہن ساقی
یہاں انسانیت پر کوئی دو آنسو نہیں روتا
یہاں لاشے پڑے رہتے ہیں بے گور و کفن ساقی

وہاں بھی میرا استقلال نے دامن نہیں چھوڑا
جہاں امید کی دیکھی نہ تھی کوئی کرن ساقی

صداقت پر مری تاریخ کے اوراق شاہد ہیں
مجھے بازیچۂ اطفال ہے دار و رسن ساقی

محبّت کی زباں سے فرض جب آواز دیتا ہے
مجاہد اپنے سر سے باندھ لیتا ہے کفن ساقی

یہ سب کچھ بادلِ ناخواستہ کہنا پڑا مجھ کو
مجھے مجبور کرتی ہے مری خاکِ وطن ساقی

کسی فتنے سے اب مخمورؔ خائف ہو نہیں سکتا
یہی ہوگا کہ ہو جائے فراقِ جان و تن ساقی

(مخمور دہلوی)

غمِ زمانہ نہیں اک عذاب ہے ساقی
شراب لا، مری حالت خراب ہے ساقی

شباب کے لئے توبہ، عذاب ہے ساقی
پلا شراب، کہ پاسِ شباب ہے ساقی

پلا دے آج تو جتنی شراب ہے ساقی
کہ موسمِ گل و فصلِ شباب ہے ساقی

کھلا رہی ہے نئے پھول، یاسمینِ فلک
پلا دو پھول کہ رشکِ گلاب ہے ساقی

چھلک رہا ہے یہ ساغر میں کس کا حسن و شباب
یہ کون پردہ نشیں، بے حجاب ہے ساقی

اٹھا پیالہ کہ گلشن پہ پھر برسنے لگی
وہ مے کہ جس کا قدح ماہتاب ہے ساقی

ڈبو دے آج تو مجھ کو، حبابِ ساغر میں
کہ زندگی کا محل بھی حباب ہے ساقی

ہیں سحر سے بہم، مہک رہیں شام و سحر
کہ ماہتاب قدح، آفتاب ہے ساقی

جھلک رہی ہے یہ ساغر میں تری برقِ جمال
کہ میرا گم شدہ رنگیں شباب ہے ساقی

نکال پردۂ مینا سے دخترِ رز کو
گھٹا میں کس لئے یہ ماہتاب ہے ساقی

سیاہ خانۂ غم بن رہی ہے کل دنیا
کہ یاد لوں میں ترا آفتاب ہے ساقی

یہ سوزِ داغ کب تک، برنگِ لالۂ طور
یہ زندگی تو سراسر عذاب ہے ساقی

کتاب پڑھنے دے زاہد کو جا کے مسجد میں
مرے لئے ترا ساغر کتاب ہے ساقی

زمانے بھر کے غموں کو ہے دعوتِ آزار
کہ ایک جام میں سب کا جواب ہے ساقی

گرا دیں ایک ہی ٹھوکر میں قصرِ ہستی کو
پلا، کہ آج سرِ انقلاب ہے ساقی

پڑی ہے عمر بہت زہرِ دہر پینے کو
شراب دے ابھی فصلِ شباب ہے ساقی

چل اک بہشت بسائیں سرور و مستی کی
بہشتِ دہر تو ہم سے خراب ہے ساقی

چکھا دے آج کہ کل کی خبر کسے معلوم
نشاطِ عمر، نمودِ حباب ہے ساقی

شبِ شباب کٹے کس طرح وہ تیغ اٹھا
کہ حسن کا بادۂ گلگوں خضاب ہے ساقی

یہ کس کی یاد میں روتی ہے آج رہ رہ کر
گھٹا ہے یا مری چشمِ پُر آب ہے ساقی

ہے میکدے پہ کوئی ابرِ میکدہ رقصاں
کہ اس بہار کا پہلا سحاب ہے ساقی

تو واعظوں کی نہ سن، میکشوں کی خدمت کر
گناہ ثواب کی خاطر، ثواب ہے ساقی

مجھے پسند ہے دنیا میں اپنی ناکامی
کہ ہر ذلیل یہاں کامیاب ہے ساقی

نکال دفترِ مینائی سے وہ مصرعۂ تر
کہ جس کا مصرعۂ ثانی گلاب ہے ساقی
اگر شراب ہوئی ختم، قندِ لب ہی سہی
جہاں میں رندوں کی خدمت ثواب ہے ساقی
پلا دے تو بھی مئے بے حساب اخترؔ کو
غمِ زمانہ اگر بے حساب ہے ساقی
کلام جس کا ہے معراجِ حافظؔ و خیامؔ
یہی وہ اخترِ خانہ خراب ہے ساقی

(اخترؔ شیرانی)

اٹھا ساغر کہ دنیا درپئے آزار ہے ساقی!

زمانہ ہو کہ قسمت برسرِ پیکار ہے ساقی

دے آج تو جتنی مئے گلنار ہے ساقی!

کہ پھر ابرِ جواں رقصاں سرِ کہسار ہے ساقی

غضب ہے یہ جوانی اور ہم اس طرح کاٹیں

کہ اک اک سانس اک چلتی ہوئی تلوار ہے ساقی

زمانے کی طرح رنگت بدلنا کس سے سیکھا ہے

کبھی اقرار ہے ساقی کبھی انکار ہے ساقی

پلا دے آج تو جتنی پلائی جا سکے مجھکو

ہمائے عمر اڑنے کے لئے تیار ہے ساقی

مجھے ذوقِ بلانوشی نے یہ کیسی سزا دی ہے

اِدھر پیرِ مغاں برہم، اُدھر بیزار ہے ساقی

یہ تیرے سبزۂ پیراہن نے کیسے گل کھلائے ہیں

کہ میخانے کا میخانہ گل و گلزار ہے ساقی

پلادی جتنی چاہے اب تو یہاں ہیں کوئی دم کے
جرس کا شور گونجا، کارواں تیار ہے ساقی

زمین و آسماں سرشار و بیخود ہوں تو حیرت کیوں
اِدھر میخانہ بےخود ہے اُدھر سرشار ہے ساقی

گھٹائیں ہیں کہ خاکی پوش پریاں مسکراتی ہیں
اٹھا ساغر کہ دنیا حسن سے سرشار ہے ساقی

خمارِ شب کو رنگیں کر دے گلہائے صبوحی سے
نسیمِ صبح جاگی، ابر بھی گلبار ہے ساقی

زمانے کے غموں نے یہ سبق ہمکو سکھایا ہے
جو بیخود ہے یہاں ساقی، وہی ہشیار ہے ساقی

غنیمت جان اس صحبت کو پھر ایسی کہاں صحبت
کہ جو منظر ہے ہستی کا فنا کا آثار ہے ساقی

ترے خانہ پر قربان کر دی دولتِ ہستی
پھر اس پر بھی گلہ، میری دعا نادار ہے ساقی

چمن بیخود، دمن بیخود، فضا بیخود، ہوا بیخود
افق سرمست ہے، ابرِ رواں سرشار ہے ساقی

نسیمِ شام دل کے ولولوں کو گدگداتی ہے

خدائی کیف و رقص و وجد سے سرشار ہے ساقی

یہ بادل ہیں کہ ہیں رنگیں پرستاں بخود در رقصاں

عجب حشرِ حسیں برپا سرِ کہسار ہے ساقی

پریشاں تو بھی کر دے زلفِ مشکیں، دوشِ نازک پر

کہ صحنِ باغ میں اودی گھٹا گلکار ہے ساقی

نہ دے فرصت کہ مجھ کو ہوش آئے اپنے زخموں کا

کہ دنیا یکسر اک اہرمنِ خونخوار ہے ساقی

ادب سے مارِ تو زمرمر کی کشتی لے کر آیا ہے

تری چھوٹی فرشتوں کے لیئے درکار ہے ساقی

خریدی جا نہیں سکتی خوشی دنیائے غمگیں میں

مگر تیرے کرم سے یہ بھی کیا دشوار ہے ساقی

دلِ غمگیں کو بہلانے کی خاطر در پہ آئے ہیں

محبت ہے کہ جلتے جی کا اک آزار ہے ساقی

اٹھا تو شاہدِ صہبا کو خوابستانِ مینا سے

بہارِ صبح جاگ اٹھی، چمن بیدار ہے ساقی

غموں کے ہاتھ سے مر مر کے جینا کیا قیامت ہے
خوشی کا جام لا دے، زندگی دشوار ہے ساقی

دماغ و دل میں بال افشاں کچھ اس صورت سے تتلی ہے
چھلکتا جام گویا طائرِ اڑنکار ہے ساقی

خدائی ہے کہ ہے اک بزم گلباری و گلکاری
اِدھر گلبار ہے بدلی، اُدھر گلکار ہے ساقی

محبت کر غمِ دنیا ستائے تو محبت کر!
محبت اس جہاں میں اک حسیں آزار ہے ساقی

محبت میں مزے لے لے کے مرنا تو مقدر ہے
مگر اس کے لئے کچھ زندگی درکار ہے ساقی

عجب کیا ہے "مری" کی رات آنکھوں ہی کٹ جائے
اِدھر بے خواب ہے اختر ہے اُدھر بیدار ہے ساقی

(اختر شیرانی)

کوہ مری

اٹھا ساغر، کہ انساں کشتۂ آلام ہے ساقی
یہ ہر لبطِ یہ سے، آگے خدا کا نام ہے ساقی
نہ جانے نوعِ انساں کیوں اجل سے خوف کھاتی ہے
اجل کہتے ہیں جس کو زحمتِ یک گام ہے ساقی
سناؤں سازِ حکمت کے ترانے کس توقع پر
کہ اب تک نوعِ انساں بندۂ اوہام ہے ساقی
صداقت آج بھی پوشیدہ ہے اولادِ آدم سے
دروغِ مصلحت آمیز اب بھی عام ہے ساقی
ادھر یہ قول ہم نے شرح کر دی ہے حقایق کی
ادھر اب تک وہی ابہام کا ابہام ہے ساقی
ادھر "تکمیلِ دیں" کا ہو چکا ہے دعوئی محکم
ادھر ایمان تھا جیسا خام اب تک خام ہے ساقی
اُدھر شدّت کے ساتھ اعلان ہے "اتمامِ نعمت"
اِدھر ہر سالس اب تک زہر کا اک جام ہے ساقی

کہا جاتا ہے مجھ سے زندگی انعامِ قدرت ہے
سزا کیا ہوگی اُس کی، جس کا یہ انعام ہے ساقی

شکایت کیا کسی خونریز چنگیز و ہلاکو کی
خود اپنا دل ہی جب خونریز و خوں آشام ہے ساقی

عمل کا رشتہ ہے جب دستِ دماحولِ وراثت میں
تو پھر کیوں آدمیّت موردِ الزام ہے ساقی

وہاں بخشا گیا ہے میرے دل کو ذوقِ آزادی
جہاں موجِ ہوا اک مرغِ زیرِ دام ہے ساقی

تبسم اک بڑی دولت ہے اس کا میں قائل ہوں
مگر یہ آنسوؤں کا ایک شیریں نام ہے ساقی

لڑکپن تھا میں روتا تھا، جوانی دل کو رولاتی ہے
نہ جب آرام تھا ساقی نہ اب آرام ہے ساقی

تمنائیں جگاتی ہیں تو ناکامی سلاتی ہے
نہ اپنی صبح ہے، ساقی نہ اپنی شام ہے ساقی

ادب کر اس خرابانی کا جس کو جوش کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظِ خیام ہے ساقی

مست نگر
جام بھر

لا ادھر شراب
ساقیا ساقیا

نظر ملا
پلا پلا

آج مرے ہوش اڑا
ساقیا ساقیا

بھلا دے غم
دکھا کرم

مست پھر مجھے بنا
ساقیا ساقیا

(بہزاد لکھنوی)

آج بھی یوں تو ہر رند جواں ہے ساقی
مگر اک آن جو پہلے تھی کہاں ہے ساقی

زندگی سلسلۂ خواب گراں ہے ساقی
لا تو وہ فتنۂ بیدار کہاں ہے ساقی

حرم و دیر کا چھٹنا نہ گوارا، لیکن!
دل کو آرام وہاں تھا نہ یہاں ہے ساقی

طنز و تعریض کی آخر کوئی حد ہوتی ہے
آدمی ہوں، مرے منہ میں بھی زباں ہے ساقی

اپنے رندوں کا نہ احساس نہ رندوں کی خبر
دہر سے آج خدا جانے کہاں ہے ساقی

زیست ہے یا تری نظروں کے اشاراتِ لطیف
موجِ صہبا ہے یا فردوسِ رواں ہے ساقی

(جگر مرادآبادی)

تجھے کیا دورِ مشکل ہے، یا زمانِ خار ہے ساقی!
تو خود اپنی جگہ اک دولتِ بیدار ہے ساقی!

حقیقت کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتی دو عالم کی
جو کچھ آتی بھی ہے ناقابلِ اظہار ہے ساقی

ترے مستوں کو روز و شب کی آویزش سے کیا مطلب
یہاں تو تیرگی بھی مطلعِ انوار ہے ساقی!

یہاں ہر عقدہ، اک کھلتا ہوا در ہے فراغت کا
یہاں ہر قید اک گرتی ہوئی دیوار ہے ساقی

قسم اس جام کی رقصاں ہے جس میں کیف و سرمستی
کہ اس مٹھی میں روحِ ثابت و سیّار ہے ساقی

نہ گھبرا انتہائی صبر و نرمی سے مدارا کر
کہ عقلِ انساں کی اک عمر سے بیمار ہے ساقی

بہت عجلت نہ فرما کارو بارِ دل کے اجرا میں
کہ یہ دنیا اسیرِ اندک و بسیار ہے ساقی

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

عقائد کے ہزاروں عقل فرسا کارواں کو
فقط اک واہمہ ہی قافلہ سالار ہے ساقی

مرا ایماں ہے اک لرزہ براندام سے دیتی
مرا اقرار اک سہما ہوا انکار ہے ساقی

نظر کر جوشؔ پر اپنے کہ اتنی بے خودی پر بھی
یہ رندِ لاابالی کس قدر ہشیار ہے ساقی

(جوشؔ ملیح آبادی)

آ کہ پھر صحنِ چمن باغِ جناں ہے ساقی
دور تک سلسلۂ ابرِ رواں ہے ساقی

آج خاشاک کے لب پر بھی ہیں شیریں نغمے
آج ذرّات کے منہ میں بھی زباں ہے ساقی

اس برستے ہوئے موسم کی ہر اک ساعتِ کیف
شبِ آدینۂ ماہِ رمضاں ہے ساقی

بزمِ پروادیٔ ایمن کا گماں ہوتا ہے
آج وہ نور سرِ رطلِ گراں ہے ساقی

خار بدمست ہیں، گل وجد میں کلیاں سرشار
آج گلشن میں قیامت کا سماں ہے ساقی

پائے جاناں پہ کروں کیوں نہ پیاپے سجدے
شورِ قلقل مجھے گلبانگِ اذاں ہے ساقی

غمِ ایام یہ دم بھر کے لئے غور کریں!
اتنی فرصت ترے مستوں کو کہاں ہے ساقی

بے خطر ہو کے پلا مے کہ حقیقت میں قضا
بزدلوں کا فقط اک وہم و گماں ہے ساقی
روک رندوں کو نہ نادیر کہ در دریہ بہار
موسمِ بندگیٔ لالہ رُخاں ہے ساقی
نرمی و لطف سے لے کام کہ دل کے ہاتھوں
زندگی کارگہِ شیشہ گراں ہے ساقی
کیفِ صہبا سے امنگوں کو جگا دے تو بھی
فیضِ باراں سے ہر اک ذرّہ جواں ہے ساقی
آج جی بھر کے پلا باغ میں پگھلی ہوئی آگ
کوہساروں پہ گھٹاؤں کا دھواں ہے ساقی
نشّہ جس طرح مچلتا ہے رگِ صہبا میں
سینۂ ابر میں یوں برق تپاں ہے ساقی
ان کی خلقت نہیں حورانِ بہشتی کے لئے
یہ تو زہّاد کی شکلوں سے عیاں ہے ساقی
ہاں پلا آتشِ سیّال کہ جس کی ہر بوند
شمعِ محرابِ جہانِ گزراں ہے ساقی

ان لچکتی ہوئی شاخوں کے خنک سائے میں

مے کی اک بوند متاعِ دو جہاں ہے ساقی

آ! کہ یہ وقت ہے اک شمع سرِ جادۂ باد

اٹھ! کہ یہ عمرِ رواں آبِ رواں ہے ساقی

شیخ کو کون یہ سمجھائے کہ گل رنگ شراب

مایۂ تربیتِ روحِ رواں ہے ساقی

تجھ سے ممکن ہو تو اس درد کا درماں کر دے

زندگی تو مرضِ سود و زیاں ہے ساقی

جوشؔ اعظم کی صدارت میں پس و پیش نہ کر

جوشؔ تو قبلۂ رندانِ جہاں ہے ساقی

(جوشؔ ملیح آبادی)

میکدہ آج سے ہے مِلکِ عوام اے ساقی
اک جام اور دے جمہور کے نام اے ساقی
کون لالے کی طرح داغِ جگر رکھتا ہے
کون لے تازہ بہاروں کا سلام اے ساقی
کوئی آنسو کوئی شبنم، کوئی آکاش کی بوند
کوئی قطرہ نہیں دریا کا غلام اے ساقی
مے تو ہے ایک، مگر ہوتی ہے تقسیم کے بعد
ساغرِ شیخ و برہمن میں حرام اے ساقی
نہ پیالوں میں شراب اور نہ محفل میں چراغ
تو نے دیکھی ہے غریبوں کی بھی شام اے ساقی
اور ہوں گے جنہیں صہبا کا تقاضا ہوگا
ہم کو خالی ہی پیالے سے ہے کام اے ساقی
ہیرے اور شیشے کا مول ایک ہے بازاروں میں
جوہری ہوں تو جواہر کے ہیں دام اے ساقی

(نشورؔ واحدی)

ساقی مرے حسین و جواں ساقیا ادھر
گاتی ہوئی نگاہ بہکتی ہوئی نظر
ساغر اٹھا کہ موسم گل ہے شباب پر
مستانہ انکھڑیوں کی جوانی بھی اس میں ڈال
میرے پری جمال
میں شاعرِ شباب ہوں اتنا رہے خیال
میرے پری جمال
کالی گھٹا نے بال بکھیرے ہیں دوش پر
سینے میں ولولوں کا سمندر ہے جوش پر
غلبہ ہے ملحدانہ عقائد کا ہوش پر
روزِ جزا کے وہم کو اب ذہن سے نکال
میرے پری جمال
میں شاعرِ شباب ہوں اتنا رہے خیال
میرے پری جمال
سوگند تجھ کو تیرے ابلتے شباب کی
ہونٹوں سے رس نچوڑ کے بوتل شراب کی

پروا کسے ہے روزِ عذاب و ثواب کی

ساغر اٹھا کہ ہو رہی ہے زندگی وبال

میرے پری جمال

میں شاعرِ شباب ہوں اتنا رہے خیال

میرے پری جمال

یہ نرم بازوؤں کی بناوٹ یہ دلکشی

ہاتھوں میں چوڑیوں کی سجاوٹ یہ دلکشی

پلکوں کی مست تھکاوٹ یہ دلکشی

اس ساعتِ جواں میں نہ رندوں کو کر نڈھال

میرے پری جمال

میں شاعرِ شباب ہوں اتنا رہے خیال

میرے پری جمال

ساون ہے، تو ہے، میں ہوں، جوانی پہ ہے نکھار

شیشے میں ہنس رہی ہے کوئی دخترِ بہار

اک لغزشِ حسیں کے لئے دل ہے بے قرار

ساغر میں بھر کے آج پلا دے مئے دھمال

میرے پری جمال

ہیں مشاعرِ شباب، ہوں انتشار ہے خیال

میرے پری جمال

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مدہوشیاں بکھیر

جذبات ہوں جواں وہ سرگوشیاں بکھیر

گاتی، بہکتی، جھومتی بے ہوشیاں بکھیر

رہ جائے مجھ سے پیچھے کہیں حدِ اعتدال

میرے پری جمال

ہیں مشاعرِ شباب، ہوں انتشار ہے خیال

میرے پری جمال

میخانے کھلتے ہیں تری انکھڑیوں کے پاس

مجھ کو یہ بھی سمٹی جوانی نہیں ہے راس

الطاف تیرا ہو کے رہے اس طرح اداس

اک جام آتشیں دے کہ طبیعت ہے پُرملال

میرے پری جمال

ہیں شاعرِ شباب، ہوں انتشار ہے خیال

میرے پری جمال

(الطاف مشہدی)

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی
تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی
میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی
شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی
عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی
سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
نہ ہو روشن، تو سخن مرگِ دوام ہے ساقی
تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
ترے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی

(اقبال)

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دل کے ہر ذرّے میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی
متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللّٰہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی
وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی
حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا
پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی
نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گِلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی
نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی
فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی

(اقبال)

پلائے جا، پئے جا خوب ساقی
کہ ہستی ہے سراسر اتفاقی
جہاں کی لذتوں سے تھک چکا ہوں
نہیں کوئی تمنا دل میں باقی!
بتانِ ہند سے تنگ آچکے ہم
کدھر ہیں نازنیتانِ عراقی!
غموں کا سایہ کب تک زندگی پر
گنوا دے میکدے میں عمر باقی
چھلک جائے نہ مینائے دو عالم
ہمارا ہاتھ ہے اور زلفِ ساقی
نہیں ہے عشق اگر اختر تو کیوں ہیں
یہ راتیں اور غزلہائے فراقی!

(اختر شیرانی)

پھر امن کی رنگین وادی سے ہنگامۂ گیر و دار اٹھا
دنیائے سکوں کے پہلو میں سر فتنۂ حشر آثار اٹھا
ہستی کے بہاریں مطلع پر پھر ابر شرارہ بار اٹھا

بے کار ہیں چنگ و ستار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

پھر کارگہ انسانی پر خونخواری و دحشت پھیلی ہے
اقصائے زمیں ہے فتنوں سے پُر اور فتنوں کی ہیبت پھیلی ہے
یزداں کی حکومت مٹ سی گئی، شیطاں کی حکومت پھیلی ہے

پھر غلغلۂ تاتار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

پھر طبل وغا کا شور ہوا، آفاق کے ایواں کانپ اٹھے!
پھر باغ و گلستاں کانپ اٹھے، پھر دشت و خیاباں کانپ اٹھے
صحرا و کہستاں کانپ اٹھے، دریا و بیاباں کانپ اٹھے

آوازۂ گیر و دار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

مغرب کی فضائے بحری سے طوفاں کی صدائیں آتی ہیں
بادل گرجے، ہواؤں میں مرگ و ہلاکت کی پریاں لہراتی ہیں
اور برق و شرر کے سازوں پر اک نغمۂ خونیں گاتی ہیں

پھر صلصلۂ پیکار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

سربازوں کے جنگی نعروں سے پھر ساحل و میداں گونجتے ہیں
طیاروں کی آتشباری سے ہامون و کہستاں گونجتے ہیں
دریاؤں کے تہہ میں موتوں کے بکھرے ہوئے طوفاں گونجتے ہیں

یا دیو شرارہ خوار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

سن وقت کی آواز آتی ہے وہ دورۂ غفلت ختم ہوا
ساز کو الٹ، بربط کو اٹھا، ہنگامۂ عشرت ختم ہوا
جانبازی کی ساعت آپہنچی، رویائے محبت ختم ہوا

بس جام و سبو بیکار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

پہلو سے ہٹا دے دستۂ گل ہنگامِ بہاراں رخصت ہے
نظروں میں سماتے نقشۂ میداں کا تزئینِ گلستاں رخصت ہے
پھر صبحِ قیامت آپہنچی، پھر لطفِ شبستاں رخصت ہے

پھر مہرِ قیامت بار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

دشمن ہے قیصر اور خطرے میں ہے ماہ لقائے آزادی
دل میرا نثارِ آزادی، جاں میری فدائے آزادی
اٹھ جلد کہ غاصب چھین نہ لیں ہاتھوں سے نوائے آزادی

وہ ہلہلۂ یلغار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

غیرت، کہ عدو کے نرغے میں خاکِ وطن بستانِ وطن
ناپاک قدم سے غیروں کے آلودہ ہو میدانِ وطن
یہ عمرِ جواں گھڑکا رِ وطن، یہ عشقِ حسیں قربانِ وطن

پھر دل کو لئے پیکار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

وہ دیکھ وطن کی سرحد پر دشمن کے عساکر چھانے لگے
موجوں کی طرح بل کھانے لگے طوفاں کی طرح لہرانے لگے
دامانِ افق سے طیارے آگ اور دھواں برسانے لگے

یا ابرِ سرِ کہسار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

ہم مست ہیں لیکن تیغ بکف میداں میں جانے والے ہیں
اعدائے وطن کے سینوں پر بجلی سی گرانے والے ہیں
اور ان کے وطن میں ان کی جگہ فریادیں بسانے والے ہیں

یہ چنگ ہٹا، یہ تار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

دشمن کا لہو پینا ہے ہمیں رہنے دے مئے گلفام نہ دے
تلوار اٹھانے والوں کے ہاتھوں میں چھلکتا جام نہ دے
صہبا کی جگہ رقصاں ہے لہو، مستی کا فریبِ خام نہ دے

یہ جامِ مئے گلنار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

ناموسِ وطن کو غیروں کے پنجے سے بچانے جاتے ہیں
مدت سے ہیں پیاسی تلواریں پیاس ان کی بجھانے جاتے ہیں
دشمن کی تڑپتی لاشوں کا کھیل ان کو دکھانے جاتے ہیں

لا برقِ فنا آتار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

وہ دیکھ اس اونچی چوٹی سے جو دور، دکھائی دیتی ہے
لیلائے وطن کی دردبھری آواز سنائی دیتی ہے
جو اڑتے ہوئے پرچم کے تلے رو رو کے دہائی دیتی ہے

سن حشر سر کہسار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

میں رک نہیں سکتا جاؤں گا اور دھوم مچاتا جاؤں گا
بربط کی طرح ان وادیوں میں تلوار بجاتا جاؤں گا
اس سازِ حسیں پر حبِ وطن کے نغمے سناتا جاؤں گا

بربط کو ہٹا، ہتھیار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

اٹھ، نام و شرف کی موت اچھی، بے نام و شرف جینے سے
ہے خونِ عدو پینے میں سوا لذّت مئے سادہ پینے سے
بکھری ہوئی اک مستانہ صدا آتی ہے فضا کے سینے سے

پھر ہمہمۂ سرشار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

پھر چشم براہ جرأت ہے لیلائے شہادت میداں میں
شاداب ہوا کرتی ہے سدا ہر قوم کی عظمت میداں میں
تلواروں کی خونیں بارش سے کھل جاتی ہے جنت میداں میں

گلہائے طرب کا ہار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

بجلی کی طرح رگ رگ میں رواں پھر عشقِ تپانِ ملّت ہے
شیرانہ سوئے جنگاہ رواں ایک ایک جوانِ ملّت ہے
اور قومی نشاں میں بال فشاں پھر شوکت و شانِ ملّت ہے

وہ رایتِ عظمت بار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

خاموش کر اپنے بربط کو خوابوں کا اثر ہر تار میں ہے

وہ لطف کہاں اس ساز میں جو تلواروں کی اک جھنکار میں ہے

ہنگامۂ قتل و غارت کا ارمان دلِ سرشار میں ہے

یہ بربطِ راحت بار اٹھا

اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

ہشیار، کہ ہو جائے نہ کہیں پامالِ خزاں، گلزارِ وطن با

گلہائے ارم سے بڑھ کے ہمیں محبوب ہے اک اک خارِ وطن

گہوارۂ ماہ و انجم ہے رفعت کدۂ کہسارِ وطن۔

پھر دل میں سرِ پندار اٹھا

اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

مانا کہ کوئی ذرہ بھی یہاں، آزادِ غمِ ایام نہیں

قابو میں کسی کے صبح نہیں، قبضے میں کسی کے شام نہیں

پر عشقِ وطن کے ماروں کا مرنے کے سوا کچھ کام نہیں

آنکھیں، ہوئیں کیوں خونبار اٹھا

اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

(اختر شیرانی)

دیکھ کے مستی کی ارزانی
موسم کی مخمور جوانی
بہکی ہوئی سبزے کی ادائیں
پھولوں کی رنگیں قبائیں
بکھرے ہوئے شبنم کے دانے
مستی کے آئینہ خانے
کلیوں میں انوار کے دھارے
سمٹے ہوئے جنت کے نظارے
دل میں جنوں امڈ آتا ہے
خون رگوں میں لہراتا ہے
رقص نغمے کا دور اے ساقی
اور اے ساقی اور اے ساقی
چھوڑ مجھے لا جام کہاں ہے
بادۂ جاں آرام کہاں ہے

پینے دے پینے دے مجھ کو
جینے دے جینے دے مجھ کو
بد مستوں کا کام ہے پینا
کیف میں مرنا کیف میں جینا
دنیا خوں آشام ہے ساقی
پامالِ اوہام ہے ساقی
دنیا داری عیاری ہے
مکاری ہی مکاری ہے۔
اور جو ساقی دینداری ہے
عیاری در عیاری ہے
ارمانوں کو مار کے ساقی
دین اور دنیا ہار کے ساقی
میخانے میں آیا ہوں میں
بے حس دل کو لایا ہوں میں
بے حس دل کو بہلانے دے
پی کر کیف میں لہرانے دے

میرے ہاتھ کو روک نہ ساقی
روک نہ ساقی، ٹوک نہ ساقی
پینے دے، پینے دے مجھ کو
جینے دے جینے دے مجھ کو
بدمستوں کا کام ہے پینا
کیف میں مرنا کیف میں جینا
دنیا اک سراب ہے ساقی
امیدوں کا خواب ہے ساقی
کارگہِ ایام ہے فانی
صبح ہے فانی شام ہے فانی
سورج فانی، تارے فانی
موجوں کے گہوارے فانی
ہر ویرانے اور بستی پر
ہر اونچائی اور پستی پر
وقت کا چکر گھوم رہا ہے
موت کا بادل جھوم رہا ہے

عشق کا مقصد آہیں بھرنا
اور جینے کا مقصد مرنا
پینے دے پینے دے مجھ کو
جینے دے جینے دے مجھ کو
بدمستوں کا کام ہے پینا
کیف میں مرنا، کیف میں جینا

(باقی صدیقی)

گذر رہی ہے مری زیست تلخ تر ساقی
شرابِ تند سے جامِ نشاط بھر ساقی

نہ ذکر چھیڑ زمانے کی کم نگاہی کا
فریبِ پیرِ مغاں کی نہ بات کر ساقی

ہزار بار فلک سے گذر گیا خورشید
ہوئی نہ شب مری آسودۂ سحر ساقی

مجھے یہ گردشِ دوراں کہاں پہ لے آئی
نہ خوش ہیں قافلے والے نہ راہبر ساقی

ہزار لعل و گہر سے جو بیش قیمت ہیں
میں تیری نذر کو لایا ہوں وہ گہر ساقی

لٹا ہے شوق کی وادی میں کاروانِ حیات
کسی کی یاد میں تڑپا ہوں عمر بھر ساقی

ستم تو یہ ہے کہ اس میکدے میں اب فاروق
نہ رند اہلِ نظر ہیں نہ دیدہ ور ساقی

(بشیر فاروق)

آج پی کر بھی وہی تشنہ لبی ہے ساقی
لطف میں تیرے کہیں کوئی کمی ہے ساقی

تیرے ہر جام میں اک طرفہ نشہ تھا شاید
ہر ادا میرے بہکنے کی نئی ہے ساقی

لا تری بزم میں کچھ اور چراغاں کر دوں
ابھی سینے میں مرے آگ دبی ہے ساقی

چاندنی شیشے سے سپنوں میں اتر آئی ہے
موجِ مے ہے کہ تری جلوہ گری ہے ساقی

ہے فروغِ مئے گلگوں کہ ترا عکسِ جمال
کیسی شیشے میں پری ناچ رہی ہے ساقی

تیرے مے خانے پہ الزام نہ آجائے کہیں
میرے حصے میں وہی تشنہ لبی ہے ساقی

میں نہیں وہ جو ہر اک شیشے سے ساغر کو بھروں
ہاں! کبھی تو نے پلائی ہے تو پی ہے ساقی

آج نہ سمجھیں اسے شیخ و برہمن تو نہ سہی
تیرے مے خانہ کی توقیر بڑی ہے ساقی

کج کلاہی، ترے رندوں کی نظر میں نہ جچی
یوں خزانے میں ترے کوئی کمی ہے ساقی

منتظر ہے مری اک وادیٔ پُر خار سرور
اور آمادۂ صد عشوہ گری ہے ساقی

(آل احمد سرور)

میری مستی میں بھی اب ہوش ہی کا طور ہے ساقی
ترے ساغر میں یہ صہبا نہیں کچھ اور ہے ساقی

بھڑکتی جا رہی ہے دمبدم اک آگ سی دل میں
یہ کیسے جام ہیں ساقی، یہ کیسا دور ہے ساقی

وہ شے دے جس سے نیند آجائے عقلِ فتنہ پرور کو
کہ دل آزردۂ تمیزِ لطف و جور ہے ساقی

کہیں اک رند اور درماندۂ افکارِ تنہا ساقی
کہیں محفل کی محفل طور سے بے طور ہے ساقی

جوانی اور یوں گھر جائے طوفانِ حوادث میں
خدا رکھے، ابھی تو بے خودی کا دور ہے ساقی

چھلکتی ہے جو تیرے جام سے اس مے کا کیا کہنا
ترے شاداب ہونٹوں کی مگر کچھ اور ہے ساقی

مجھے پینے دے، پینے دے کہ تیرے جامِ لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے کچھ اور ہے، کچھ اور ہے ساقی!

(اسرار الحق مجاز)

یہ جہاں بارگہِ رطلِ گراں ہے ساقی
اک جہنم مرے سینے میں تپاں ہے ساقی
جس نے برباد کیا، مائلِ فریاد کیا!
وہ محبت ابھی اس دل میں جواں ہے ساقی
ایک دن آدم و حوا بھی کئے تھے پید ا
وہ اخوت تری محفل میں کہاں ہے ساقی

ہر چمن دامنِ گل رنگ ہے خونِ دل سے
ہر طرف شیون و فریاد و فغان ہے ساقی
ماہ و انجم مرے اشکوں سے گہر تاب ہوئے
کہکشاں نور کی اک جوئے رواں ہے ساقی
حسن ہی حسن ہے جس سمت بھی اٹھتی ہے نظر
کتنا پر کیف یہ منظر، یہ سماں ہے ساقی
میرے ہر لفظ میں بے تاب ہوا سوزِ دروں
میری ہر سانس محبت کا دھواں ہے ساقی

(اسرار الحق مجاز)

عقائد وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی

"حقیقت آشنائی" اصل میں گم کردہ راہی ہے
عروسِ آگہی پروردۂ ابہام ہے ساقی

مبارک ہو ضعیفی کو خرد کی فلسفہ دانی
جوانی بے نیازِ عبرتِ انجام ہے ساقی

ابھی تک راستے کے پیچ و خم سے دل دھڑکتا ہے
مرا ذوقِ طلب شاید ابھی تک خام ہے ساقی

وہاں بھیجا گیا ہوں چاک کرنے پردۂ شب کو
جہاں ہر صبح کے دامن پہ عکسِ شام ہے ساقی

مرے ساغر میں مے ہے اور ترے ہاتھوں میں بربط ہے
وطن کی سرزمیں میں بھوک سے کہرام ہے ساقی

زمانہ برسرِ پیکار ہے پر ہول شعلوں سے
ترے لب پہ ابھی تک نغمۂ خیام ہے ساقی

(ساحر لدھیانوی)

خرد فسانہ و تمثیل و خواب ہے ساقی
جنوں ہوائے شبِ مہتاب ہے ساقی
ہے میکدہ وہ خلاصہ رموزِ دانش کا
جہانِ حقیقت دریا حباب ہے ساقی
بچا بچا کہ متاعِ نظر ہے خطرے میں!
جگا جگا کہ خرد محوِ خواب ہے ساقی
سمجھ گیا ہوں میں تیری نگاہ کا مطلب
نظر ہی رنگ نظر ہی شراب ہے ساقی
بکھیر گیسوئے مشکیں کہ قصدِ سجدہ ہے
اٹھا پیالہ کہ عزمِ خطاب ہے ساقی
انھیں بھی چوٹ لگی ہے تری مروّت کی
گلوں کا رنگ بھی رنگِ شراب ہے ساقی
عدم سے روشنی لیتے ہیں اہلِ عقل و خرد
بہ رندِ مستِ نظر، آفتاب ہے ساقی

(عدمؔ)

سحر سے خوں بداماں آسمان پیر ہے ساقی
زمانے پر مسلط جنگِ عالمگیر ہے ساقی
اسیروں نے جو دیکھا تھا کبھی فصلِ بہاراں میں
مآلِ کشمکش اس خواب کی تعبیر ہے ساقی
بدلتی جا رہی ہے ذہنیت اربابِ دانش کی
ہر اک موجِ نفس چلتی ہوئی شمشیر ہے ساقی
نہ ہو مایوسِ مستقبل۔ ابھی کھل جائیگا تجھ پر
زمانے میں ترے رندوں کی کیا توقیر ہے ساقی
قسم اس آتشیں ماحول کی تجھ کو، اٹھا ساغر!
کہ ہر تخریب کے پردے میں اک تعمیر ہے ساقی
(شکیل بدایونی)

اپنا اعجاز دکھا دے ساقی
آگ سے آگ بجھا دے ساقی

وہ اٹھیں کالی گھٹائیں توبہ
اب تو پینے کی رضا دے ساقی

جس سے سوئے دل چونک اٹھیں
نغمہ اک ایسا سنا دے ساقی

تجھکو مستقبلِ زرّیں کی قسم
پچھلی باتوں کو بھلا دے ساقی

وہ جو تسبیح لئے ہے اس کو
مرے آگے سے اٹھا دے ساقی

تشنگیٔ فکر ابھی باقی ہے
اک جام اور اٹھا دے ساقی

قصرِ اوہام کو ڈھانے کیلئے
سارا میخانہ لنڈھا دے ساقی

سب جسے کہتے ہیں وامق وامق
ہم کو بھی اس سے ملا دے ساقی

(وامق جونپوری)

حیات نام ہے جس کا شرار ہے ساقی
علاج اس کا مئے خوشگوار ہے ساقی

نہ دیکھو میرے گریباں کی عصمت حیرت سے
تری قبا بھی یونہی تار تار ہے ساقی

دلوں کو دام میں لانا ہی شہریاری ہے
خلوص سب سے بڑا اقتدار ہے ساقی

غمِ زمانہ کو کیا اور شرمسار کروں
غمِ زمانہ بہت شرمسار ہے ساقی

چل آکے بادہ پئیں اور چمن میں رقص کریں
فضا جوان ہے ہوا مشکبار ہے ساقی

نظامِ عالمِ کہنہ کو منتشر کر دے
میری طرف سے تجھے اختیار ہے ساقی

عدمؔ بھی ایک تجلی ہے اس غمستاں کی
جہاں گدا کی صفت شہریار ہے ساقی

(عدمؔ)

تیرے ہر جام کا یکساں ہے مزا اے ساقی
اب پلانی ہے تو کچھ اور پلا اے ساقی
وہی پیمانہ فروشی وہی قطروں کا شمار
وہی انداز پرانا ہے ترا اے ساقی
جاں بلب پیاس سے کوئی، کوئی بدمستی سے
کیا یہی مے ہے تری آب بقا اے ساقی
اب نئے رنگ کے میخوار یہاں آئیں گے
اب یہاں سے تو دکان اپنی بڑھا اے ساقی

محمد دین تاثیر

جام دے جام کہ ہے محفلِ عشرت ساقی

چھیڑ دے روح میں پھر ربطِ الفت ساقی

بدلیاں بھی ہیں سیہ کھلتی چمن بھی لیکن

دل میں آتی ہے دبے پاؤں مسرت ساقی

شکوۂ ہجر کروں یا گلۂ ظلم و جفا

اس قدر پست نہیں میری محبت ساقی

زہر کا گھونٹ سہے بار تبسم نہ جھکے بغیر

اس کی صورت کو دکھا دے کسی صورت ساقی

نقش اسکندر و دارا کو مٹا دے دل سے

اب ہماری ہے زمانے کو ضرورت ساقی

جب چھلکتی ہے کلی اشک ٹپک جاتے ہیں

غم نے بخشی ہے عجب دل کو لطافت ساقی

محفلِ عقل میں کیا کیا نہ ہوئے نغمہ طراز

ایک ذرّے کی بھی پائی نہ حقیقت ساقی

(اظہار ملیح آبادی)

پلا دے تو جو اپنے ہاتھ سے اک جام اے ساقی
تو رک جائے ابھی یہ گردشِ ایاّم اے ساقی

اگر ہوتے نہ شیریں اس قدر آغاز کے لمحے
بہت محسوس ہوتی تلخیٔ انجام اے ساقی

نہ پوچھ ان کی سیہ بختی جنھیں عشرت نے مارا ہے
وہ خوش قسمت ہیں جو ہیں کشتۂ آلام اے ساقی

اگر سُن لے مغنّی توڑ ڈالے اپنے بربط کو
بپا ہے ایک اک ذرّے میں جو کہرام اے ساقی

متاعِ جشنِ آزادی وہاں سے لے کے آیا ہوں
جہاں صیّاد بھی ہوتا ہے زیرِ دام اے ساقی

وہاں میں نے جلایا ہے حقائق کے چراغوں کو
جہاں ہر سانس ہے ابہام ہی ابہام اے ساقی

سکوں ملتا ہے دم بھر کو تو میخانے کی چوکھٹ پہ
دگرنہ دیر و کعبہ میں کہاں آرام اے ساقی

محبّت میں جسے ہے فخر اپنی کامرانی پر
حقیقت میں وہی ہے کس قدر ناکام اے ساقی
(اظہار ملیح آبادی)

تشنہ کامی کا رہے اس کی خیال اے ساقی
ہے ترا بندۂ درگاہ نہال اے ساقی

مجھ مستی جہا متی قبلہ سے یہ اٹھی ہے گھٹا
یا کوئی حور ہے کھولے ہوئے بال اے ساقی

سرخوشِ کیفِ ابد ہوں تری آنکھوں کی قسم
میری مستی نہیں پابندِ زوال اے ساقی

وہ پلا بادہ کہ پُر نور ہو کاشانۂ فکر
جگمگا دے مری اقلیمِ خیال اے ساقی

وہ مرا ہند ہے اک مرتبۂ جاہ و جلال
تھا کبھی جو ہمہ تن جاہ و جلال اے ساقی

اس جہنم کدۂ دہر میں اک جرعۂ مے
تشنہ لب کو ہے ترے آبِ زلال اے ساقی

اپنی اس ہستی ہنگامہ طلب کے ہاتھوں
فرصتِ نیم نفس بھی ہے محال اے ساقی

گرمِ پیکار ہوئیں گرگ خصائل اقوام
خونِ انساں ہے درندوں کو حلال اے ساقی

آدمیت کا ہے تابوت سرِ دوشِ کمال
آدمیت کی یہ پامالیِ کمال اے ساقی

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تہذیب ہے کیا
آدمی اور روشِ جنگ و جدال اے ساقی

یہ شبِ ماہ یہ تاروں سے برستا ہوا حسن
بزمِ امکاں ہے کہ ہے بزمِ جمال اے ساقی

ہاں چلے دور کہ ہے دورِ مئے نشۂ کیف
شیشہ و جام بہ دستور سنبھال اے ساقی

وہ طرب خیز ہوئی مے وہ مٹی یورشِ غم
وہ چلا لشکرِ اندوہ و ملال اے ساقی

تیرے ہاتھوں سے جو ملتا ہے دمِ بادہ کشی
جامِ جم ہے مجھے وہ جامِ سفال اے ساقی

جامِ لا جام کہیں جھوم کے چھیڑوں یہ غزل
ہے ترا رندِ نگاہ نہال اے ساقی

(نہال سیوہاروی)

گھٹا بھی چھائی ہے فصلِ بہار ہے ساقی
اب اس کے بعد تجھے اختیار ہے ساقی
تجھے بھی یاد وہ قول و قرار ہے ساقی
کہ میری پیاس ابھی تک ادھار ہے ساقی
شرابِ ناب سے اتنا مزاج مانوس
کہ ٹوٹے گل بھی تجھے ناگوار ہے ساقی
یہ جلترنگ سے نغمے یہ ساغروں کی کھنک
زمانہ تیرے لیے سازگار ہے ساقی
تری نگاہ کی مستی ارے معاذ اللہ
ابھی ایک جام کا اب تک خمار ہے ساقی
ادھر سے تو بھی کوئی جام آتشیں چھلکا
گھٹا کی چھاؤں سر کوہسار ہے ساقی
شکستِ جام کی آواز کو سمجھ کر سن
مرے دکھے ہوئے دل کی پکار ہے ساقی
یہ اودی اودی گھٹائیں یہ سرمئی بادل
اب انتظار بہت ناگوار ہے ساقی
تری نگاہ کی شوخی کا پڑ گیا سایہ
یہ موج مے جو بہت بے قرار ہے ساقی
ترے کرم سے زمانے کا رنگ ہے کچھ اور
کہ محتسب بھی مرا رازدار ہے ساقی

ادھر بھی بادۂ گلرنگ کا کوئی چھینٹا
نیاز مند بھی امیدوار ہے ساقی
پلائے جا کہ نہ معلوم کل ہو کیا صورت
کہ زیست چشمکِ برق و شرار ہے ساقی
میں دوسروں کی طرح بدگمان نہیں تجھ سے
ترے کہے کا مجھے اعتبار ہے ساقی
رکھی ہے کل کے لیے میکشو نے بھر کے شراب
اسی کا نام غمِ روزگار ہے ساقی
نگاہِ لطف و کرم بدنصیب ماہر پر بھی
بہت دنوں سے غریب الدیار ہے ساقی

(ماہر القادری)

اٹھ کہ خورشید کہیں لب بام اے ساقی
جلد اٹھا عصرِ جواں سال کا جام اے ساقی

جس کی سُرخی میں تھی آمیزشِ خونِ انساں
آج اس صبح کی ہونے کو ہے شام اے ساقی

حوریانِ ارمِ کہنہ کے اس دنیا میں
اب اکھڑتے نظر آتے ہیں خیام اے ساقی

ہوگا اک تازہ شریعت کا زمانے میں نفاذ
اب رہے گا یہ حلال نہ حرام اے ساقی!

قصرِ اجسام سے اجرامِ فلک کی جانب
چند ہی روز میں جائیں گے پیام اے ساقی

یہ ہلال آج جو دھندلا سا نظر آتا ہے
اسی کو ہونا ہے ابھی ماہِ تمام اے ساقی

(جوشؔ ملیح آبادی)

اٹھا ساغر کہ بیداری وبالِ ہوش ہے ساقی
زمانہ تیغ در دست و کفن بر دوش ہے ساقی

زمانہ رقص میں ہے بج رہی ہے وقت کی چھاگل
چمن میں آج وہ گلبانگِ نوشا نوش ہے ساقی

پسینہ آگیا ہے خلد میں حوروں کے ماتھے پر
حسینوں کی جوانی آج یوں گلپوش ہے ساقی

اگر اک بوند ٹپکا دوں تو لو دینے لگے دنیا
مرے ساغر میں ایسا بادۂ سرجوش ہے ساقی

زمیں کے آبگینے کو کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے
تمہارے رندوں کو مستی میں بھی اتنا ہوش ہے ساقی

اٹھا لے جامِ زریں کو بنا جامِ سفالیں سے
کہ یہ کونین کا ٹھکرانے والا جوش ہے ساقی

(جوش ملیح آبادی)

کیا مست گھٹا چھائی　　متوالی ہوا آئی
پھولوں کی یہ رعنائی　　سبزے کی یہ زیبائی

ہے فضلِ خدا ساقی
دے تم ہی لنڈھا ساقی

پر جوش و خروش آئے　　میخانہ بدوش آئے
تسنیم فروش آئے　　وہ صیقلِ ہوش آئے

آنکھیں تو اٹھا ساقی
ہاں خوب جھکا ساقی

پیمانہ بکف ہے گل　　مستانہ نوا بلبل
مئے قل کی جگہ قلقل　　ہے مست جہاں بالکل

دے تو بھی ہلا ساقی
رندوں کو پلا ساقی

اس بحرِ ترنم میں　　امواجِ تبسم میں
طوفانِ تکلم میں　　دلچسپ تلاطم میں

اٹھ بہرِ خدا ساقی
بن راہ نما ساقی

گردش میں ہو پیمانہ　　چکر میں ہو میخانہ
فرزانہ ہو دیوانہ　　دیوانہ ہو فرزانہ

وہ دور چلا ساقی
ذرّوں کو جگا ساقی

سر معرضِ طوفاں ہو　　دل حشر بداماں ہو
ہوش اتنا گریزاں ہو　　بیہوشی کا ساماں ہو

سب ہوش مٹا ساقی
مدہوش بنا ساقی

آنکھوں میں سرور آئے　　اور قلب میں نور آئے
مشعل لئے طور آئے　　شیشہ لئے حور آئے

وہ جام پلا ساقی
وہ اعجاز دکھا ساقی

اک آگ لگا دے تو　　اک شور مچا دے تو
سوتوں کو جگا دے تو　　مُردوں کو جلا دے تو

کرشمہ بپا ساقی

خمخانہ لٹا ساقی

رندوں کی یہ تقریریں کوثر کی ہیں تفسیریں

زاہد کی وہ تکبیریں ماضی کی ہیں تعزیریں

فردا کو بھلا ساقی

لطف آج اڑا ساقی

وہ بنتِ عنب آئی امرت کی ہے ماں جائی

سب اس کے ہیں شیدائی کیفی ہے کہ صہبائی

چھلک اور چھلکا ساقی

پی اور پلا ساقی

ہاں دور پیالے ہو ہر رند جم وکے ہو

یہ فرض نہیں مے ہو ہاں ایسی کوئی شے ہو

چھوڑے نہ خودی ساقی

چیز ایسی پلا ساقی

(دتاتریہ کیفی دہلوی)

سب سمجھنے کی بات ہے ساقی
جو بھی التفات ہے ساقی

جو عطا ہو تری نگاہوں سے
عاشقوں کی برات ہے ساقی

دل کو ٹھکرا نہ کم نگاہی سے
یہ مری کائنات ہے ساقی

ہم سمجھتے تھے ایک قطرہ ہے
زندگی تو فرات ہے ساقی

آتے آتے ہی نیند آئے گی
ہجر کی پہلی رات ہے ساقی

حسن پردہ ہے اک تعارف کا
عشق پردہ کی بات ہے ساقی

تیر کھانا، غزل سرا رہنا
یہ عدم کی حیات ہے ساقی

(عدم)

ستم کی اور بھی اک قیمتی تدبیر ہے ساقی
مروّت بھی فقیروں کے لئے شمشیر ہے ساقی
سنا تھا زندگی اک غنچۂ نورستہ ہے لیکن
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ نوکِ تیر ہے ساقی
اسی کہنہ یقیں پر ہے مدارِ دو جہاں اب بھی
خودی تدبیر ہے ساقی، خدا تقدیر ہے ساقی
میں جاہل ہوں مگر اس مدرسے کا طفلِ مکتب ہوں
جہاں حرفِ آدمیت لائقِ توقیر ہے ساقی
ہر ایک الزام سے دو غیر فانی رنگ ہوتے ہیں
تری تصویر میں شامل مری تصویر ہے ساقی
پلا مے اور حقیقت دیکھ لے اربابِ محفل کی
کہ مے انسان کے اخلاق کی تفسیر ہے ساقی
مرے ماحول کو تبدیل کر دے اپنی آنکھوں سے
سنا ہے آدمی ماحول کی تعمیر ہے ساقی
سرِ بازار کرنے دے عدمؔ کو رقصِ مستانہ
جوانی اک مکمل لذتِ تشہیر ہے ساقی

(عدم)

کبھی کبھی جو تہی جام مل گیا ساقی
تو تمعات کو آرام مل گیا ساقی

اٹھائی میں نے جو فہرست خسرو جم کی
تو سب سے پہلے ترا نام مل گیا ساقی

علاجِ گردشِ ایام کی ضرورت تھی
علاجِ گردشِ ایام مل گیا ساقی

حرم کی سمت رواں تھا میں اس عقیدت سے
کہ راہ میں کوئی اصنام مل گیا ساقی

بٹھایا اس کو بھی ساتھ صبح ہونے تک
وہ محتسب جو سرِ شام مل گیا ساقی

جسے طریقۂ آغاز بھی نہ آتا تھا
اسے سلیقۂ انجام مل گیا ساقی

تلاشِ کار میں پہنچے تھے ترے کوچہ تک
سو اتفاق سے کچھ کام مل گیا ساقی

تری جبیں نظر آئی تو ہم فقیروں کو
طلوعِ صبح کا ہنگام مل گیا ساقی

تری نگاہ ملی تو ہم نیازمندوں کو
تمام عمر کا آرام مل گیا ساقی

وہ دو جہان تہمت سے بچ گئے جن کو
تری نگاہ کا الزام مل گیا ساقی

عدم نے راہبری کی تو تیرا دروازہ
ہمیں بہ زحمت یک گام مل گیا ساقی

(عدم)

خرد کا ربط تو ٹوٹا سا تار ہے ساقی
جنوں کا ضبط بڑا استوار ہے ساقی

مجھے تجسس و تحقیق کی نہیں عادت
مجھے خدا پہ یونہی اعتبار ہے ساقی

مرے خلوص کی آنکھوں سے دیکھ اایکدن
وہ محیط زمین دیار ہے ساقی

میں پہلا جام اٹھاؤں گا اپنی مرضی سے
پھر اس کے بعد تجھے اختیار ہے ساقی

جسے سنبھالتی پھرتی ہے عقل سرگشتہ!
مرے زیر بند گریباں کا تار ہے ساقی

میں جل نہ جاؤں چناروں کی آگ میں گھر کر
مجھے سنبھال کہ جشنِ بہار ہے ساقی

میں بڑھ کے چوم نہ لوں تیری زلفِ برہم کو
دلیلِ رحمتِ پروردگار ہے ساقی

سب اپنی سوچ کے انداز کا کرشمہ ہے
نہ طول ہے نہ کوئی اختصار ہے ساقی

میں زندگی کی اداؤں پہ کیوں نہ جان چھڑکوں
کہ زندگی سے مجھے سخت پیار ہے ساقی

زمانہ کتنا بھی رنگین و خوبصورت ہو!
عدمؔ کی گرد سرِ رہگذار ہے ساقی

(عدمؔ)

وقت ہے حسیں ساقی رخت ہے جواں ساقی
جامِ ارغواں ساقی! جامِ ارغواں ساقی

کاکلوں سے بارش ہو اس طرح ستاروں کی
جام میں اتر آئے آج کہکشاں ساقی

آ رہے ہیں پیمانے جا رہے ہیں پیمانے
کیا رواں دواں ساقی کیا کشاں کشاں ساقی

صبحِ حشر کا تجھ کو وسوسہ ہے کیوں اتنا
خیر سے ابھی پوری شب ہے درمیاں ساقی

آج تو ارادہ ہے مان لیں کہا اس کا
آئی ہے سبو لے کر عمرِ جاوداں ساقی

واصلِ عدم کر دے اس حسیں آفت کو
آ رہی ہے کسی جانب سے مرگِ ناگہاں ساقی

(عدم)

جنوں کے گرم پسینوں کی خیر ہو ساقی
شراب رنگ پسینوں کی خیر ہو ساقی

جوانیوں کے گلابی بھنور ہیں گردش میں
دلوں کے نرم سفینوں کی خیر ہو ساقی

بڑے خلوص سے کرتے ہیں رہزنی ظالم
حرم کے راہ نشینوں کی خیر ہو ساقی

یہ کشتیاں ہیں کہ بہتے ہوئے نگینے ہیں!
سبک خرام نگینوں کی خیر ہو ساقی!

دلِ تباہ میں آبادیاں ہیں یاروں کی
مکاں کی خیر مکینوں کی خیر ہو ساقی

ہر آستاں کا تصور فلک نشیمن ہے
نیاز مند جبینوں کی خیر ہو ساقی

عطا ہوئی ہے یہیں سے عدمؔ کو ہر نعمت
ترے کرم کے خزینوں کی خیر ہو ساقی

(عدمؔ)

بزم کی بزم چور ہے ساقی
بات کوئی ضرور ہے ساقی

تیری آنکھوں کو کر دیا سجدہ
میرا پہلا قصور ہے ساقی

پوچھ لے اپنی زلفِ برہم سے
ہر اندھیرے میں نور ہے ساقی

دل کبھی مطمئن نہیں ہوتا
آگہی کا فتور ہے ساقی

تیری آنکھیں، کسی کو کیا دیں گی
اپنا اپنا سرور ہے ساقی

پھول میں، رنگ میں، اور نغمے میں
کچھ تعلق ضرور ہے ساقی

پینے والوں کو بھی نہیں معلوم
مے کدہ کتنی دور ہے ساقی

تیری توقیر گھٹ نہیں سکتی
تو ہمارا غرور ہے ساقی

زندگی کے ستم کا خمیازہ
زندگی کا شعور ہے ساقی

میرا مذہب شراب خانہ ہے
میرا مسلک سرور ہے ساقی

ہر نشیلی امنگ کا مطلب
سرخیٔ چشم حور ہے ساقی

عقل بے ربطیٔ مقاصد ہے
عشق حسن امور ہے ساقی

حرف کا دشمن نہیں عدم یونہی
شعر بھی اک سرور ہے ساقی

(عدم)

مخالف ہو فضا کیوں رند ہمت ہار دے ساقی
اٹھا مینا و ساغر لا مجھے تلوار دے ساقی

زباں پر ہو رہی ہیں کس قدر پابندیاں عائد
اٹھ اپنے میکشوں کو جرأتِ گفتار دے ساقی

گوارا کر نہیں سکتا قیامت میں جام و صہبا پر
زمانہ جس قدر چاہے مجھے آزار دے ساقی

جو دیکھے اک نظر سے مسجد و بتخانہ دونوں کو
قدح نوشوں کو ایسا دیدۂ بیدار دے ساقی

نہیں درکار ایسا مرشدِ میخانہ رندوں کو
جو دنیا کو فریبِ جبہ و دستار دے ساقی

اگر ہو امتیازی شان گم ہونے کا اندیشہ
تو میکش ایسی آزادی کو ٹھوکر مار دے ساقی

کرے حبِ وطن کے ساتھ زندہ روحِ ملت کو
شفیقِ مست کو طاقتِ ایثار دے ساقی

(شفیق جونپوری)

ماہِ تاباں ہے ابھی مستِ خرام اے ساقی
اور کچھ دیر رہے گردش میں جام اے ساقی
کیف و مستی کے لئے مے کی ضرورت کیا ہے
تیرے مستوں کو ہے کافی ترا نام اے ساقی
میکدہ، دیر و حرم بن کے نہ رہ جائے کہیں
لطفِ مے خاص ہے کر اس کو نہ عام اے ساقی
بس گئی ہے رگ و پے میں تری صہبائے نظر
حاصلِ عمر ہے یہ شربِ مدام اے ساقی
میں اسی واسطے اس سمت چلا آتا ہوں
تیری محفل میں نہیں قیدِ مقام اے ساقی
ہوشمندوں کو پلانا ہے فقط کام ترا
پی کے گر بہکیں ان کو نہ تھام اے ساقی
فخر کی بات نہیں تیری عنایت کی قسم
لوحِ ہستی پہ ہوں اک نقشِ دوام ساقی

(سکندر علی وجدؔ)

نہ ذوقِ بادۂ صہبا نہ شوقِ جام ہے ساقی
مجھے اب احتیاجِ تیغ خوں آشام ہے ساقی
ابھی بے اختیاری ہے تو ادنیٰ ترکِ مے نوشی
نہ اپنی صبح ہے ساقی نہ اپنی شام ہے ساقی
مجھے اس میرِ محفل نے دیا درسِ جہانگیری
کہ دنیا جس سے اب تک لرزہ بر اندام ہے ساقی
پلا ایسی مئے پُر کیف کہ روحوں میں سرور آئے
زمانہ دیر سے بے راحت و آرام ہے ساقی
زمانہ جاگتا جاتا ہے لیکن پیرِ مے خانہ
ابھی شکوہ سنجِ گردشِ ایّام ہے ساقی
نہیں میخانے میں کوئی کمی مینا و ساغر کی
خود اپنے ظرف کی خامی ہی کیوں بدنام ہے ساقی
پٹک دے گا صراحی، توڑ دے گا شیشۂ و ساغر
شفیقِ رندِ مستِ بادۂ اسلام ہے ساقی

(شفیق جونپوری)

ساقی، وہ کھلے پھول، اُڑا کاگ اٹھا جام
چٹکا ہے بفرمانِ طرب غنچۂ ایّام
صد شکر کہ پھر آج ہے گلدستۂ آغوش
محبوبۂ مہ چہرہ و معشوقۂ گلفام
پھر مسندِ زرّیں پہ ہیں رقصاں و غزل خواں
ترکانِ سخن چہرہ و خوبانِ گل اندام
مدہوش کھجوروں سے ابھرتا ہوا مہتاب
مہتاب میں رخشندگیٔ وجہ ذو الاکرام
اس فرش کی محراب میں یہ عرش کی قندیل
اس صبح بد آغاز کی یہ شامِ خوش انجام
پھر گنبدِ اجسام میں ہے نغمۂ ارواح
پھر عالمِ ارواح میں ہیں خندہ اجسام!
گھنگھور گھٹاؤں سے برستی ہے زمیں پر
مے پروردیٔ حافظ و سرشاریٔ خیّام

پھر باغ نے کھولا ہے درِ حرفِ حکایت
ہر برگ میں اک لفظ ہے، ہر پھول میں پیغام

اس بزم کے ناظم ہیں گدایانِ خرابات
جس بزم میں جبریل ہے منجملۂ خدّام

تم کون ہو، جو پاؤں مرے چوم رہی ہو
باندی کو "قضا" کہتے ہیں، بندی کا "قدر" نام

اے جوشؔ مرے کفر کا وہ قصر ہے عالی
جس قصرِ فلک بوس کا اک غرفہ ہے اسلام

(جوشؔ ملیح آبادی)

ادھر آ تو اے ساقیٔ خوش صفات
کہ ہے تلخ میکش کی تیرے حیات

ادھر آ کہ ہے شمعِ مے خانہ تو
منور کنِ بزمِ رندانہ تو

ادھر آ تو اے زندہ دارِ کرم
کہ قائم ہے تجھ سے وقارِ کرم

ادھر آ کہ تاب و تواں تجھ سے ہے
مرا ذوقِ مستی جواں تجھ سے ہے

ادھر آ کہ سرشار مے نوش ہو
گھڑی بھر کو رخصت طلب ہوش ہو

ادھر آ کہ ہوں غرقِ صہبائے حسن
یہ دنیا ہو نظروں میں دنیائے حسن

ادھر آ کہ آتش کو پانی کروں
نئے سر سے حاصل جوانی کروں

ادھر آکہ افسردگی دور ہو
مرا ہر نفس شعلۂ طور ہو
ادھر آکہ ذوقِ سخن تازہ ہو
مرا ایک عالم میں آوازہ ہو
ادھر آکہ گرمِ تگ و تاز ہوں
پیوں بادہ اور عرش پرواز ہوں
گذشتہ عطاؤں کی تجھکو قسم
مری التجاؤں کی تجھکو قسم
تجھے اپنے حسنِ جواں کی قسم
بہارِ گل و گلستاں کی قسم
قسم تجھکو اس چشمِ مخمور کی
قسم کیفِ صہبائے انگور کی
تجھے اپنی زلفِ رسا کی قسم
سرِ کوہ کالی گھٹا کی قسم
قسم تجھکو اگلی روایات کی
قسم مے سے بھیگی ہوئی رات کی

مرے ذوقِ فطرت نگر کی قسم
تجھے کیفِ حسنِ سحر کی قسم

قسم تجھ کو کشتِ گل و لالہ کی
قسم ہے بہشتِ گل و لالہ کی

تجھے مہرِ زرّیں طبق کی قسم
تجلائے حسنِ شفق کی قسم

قسم تجھ کو ڈھلتی ہوئی دھوپ کی
قسم شام کے سانولے روپ کی

قسم تجھ کو ہر دلکش آہنگ کی
قسم نغمۂ بربط و چنگ کی

تجھے عہدِ شرم و حیا کی قسم
تجھے پاسِ مہر و وفا کی قسم

تجھے میرے رنج و تعب کی قسم
لبِ خشک و جوشِ طلب کی قسم

صبوحی پلا دے کہ بیتاب ہوں
مجھے تو چھکا دے کہ بیتاب ہوں

(نہال سیوہاروی)

خموشی کا سبب ہم جانتے ہیں
تبسّم کی ادا پہچانتے ہیں
کلائی کے لچکنے کا یقیں ہے
بھرا ساغر چھلکتا کیوں نہیں ہے
شرارت ہے یہ سب افسونگری ہے
نگاہیں جام میں تلچھٹ بھری ہے
صدا رندوں میں نوشا نوش کی ہے
ہمیں پروا نہیں سر جوش کی ہے
چمن ذرا آنکھ میں اپنی نظر آئے
حنائی ہاتھ سے تلچھٹ لے جائے
ہوس کرنے میں کچھ جھنجھٹ بہت ہے
مزا دے جائے تو تلچھٹ بہت ہے
دعا یہ ہے، اثر اتنا خدا دے
مۓ گفتار کی تلچھٹ مزا دے

(ریاضؔ خیرآبادی)

ساقی مجھے ایک جام دینا
بھر کر شئے لالہ فام دینا
رنگت کا نکھار یہ کرے کام
یاقوت کا ایک ڈال ہو جام
دھانی چوڑی کا عکس پڑ جائے
تحریر زمرد میں نظر آئے
رنگ اور لگائے آگ بڑھ کر
مہندی لگے ہاتھوں میں ہو ساغر
مستانہ ادا نہ آس توڑے
لغزش نہ کہیں گلاس توڑے
حجلے سے ابھی نکل کے آئے
شیشے سے پری نکل کے آئے!

سو رنگ سے بن سنور کے نکلے
نکلے نکلے نکھر کے نکلے

ہو رقص فشائے صحن ساغر
ہو موج کا ہاتھ بھی کمر پر
نظارے کے ساتھ سب ہوں بیہوش
ہر بزم نشیں ہو خود فراموش
محفل میں وہ رنگ آج چھا جائے
بے ساغر دے مجھے مزا آئے
لغزش نہ مری زباں میں ہو
الجھاؤ نہ کچھ بیاں میں ہو
لو منتظرو! ذرا سنبھل جاؤ!
آنکھوں میں ہے نیند ہوش میں آؤ

مبارک ہے کشتوں کو رخصت ہوش
چلا وہ ساقیٔ وعدہ فراموش
نگاہِ ناز شرمائی ہوئی ہے
ہماری یاد کچھ آئی ہوئی ہے

چھلکتے جام یا نازک سے رنگیں ہیں
حنائی ہاتھ میں چھلوں کے رنگیں ہیں

کلائی پر گراں ہے رنگِ ساغر
نہ موجِ مے نے یہ بھی لچک کر

ہر اک مے کش کو یہ دھوکہ ہوا ہے
مئے گلرنگ سے ساغر بھرا ہے

لبِ خاموش میں طرزِ تکلّم
نہاں گھونگھٹ میں موجوں کے تبسّم

ابھرتی موج کیا دیکھی نہیں ہے
چھلکتے جام سے کیا پی نہیں ہے

بہاریں ہم نے لوٹی ہیں چمن میں
اٹھے بیٹھے نہیں کسی انجمن میں

سبو کتنے اچھوتے ہیں لنڈھائے
سنبھل کر جب اٹھے کوتر کی لائے

جو رنگت دور سے ہم دیکھتے پائیں
بھرے ساغر تو ہم آنکھوں میں پی جائیں

نہ وہ محشر فروش شوخیٔ ناز
نہ وہ ہنگامہ ہائے فتنہ پرداز
نہ کسی کی وہ چمپئی رنگت
نہ کسی کی وہ چلبلی صورت

نہ وہ نازک کمر کا بل کھانا
نہ وہ لغزش نہ وہ سنبھل جانا

نہ چھریرا بدن، نہ بکھرے بال
نہ وہ کافر کی لڑکھڑاتی چال

نہ وہ آنچل کا ڈالنا ہر بار
نہ وہ پٹا سنبھالنا ہر بار

نہ وہ شوخی نہ ہونٹھ پر وہ ہنسی
نہ بلاخیز چتونیں تیکھی

نہ وہ جوشِ شباب کی ان بن
نہ اداؤں میں اب وہ چنچل پن

نہ وہ نغمہ نہ جانفزا آواز
نہ مغنّی نہ کوئی نغمہ ساز

کیا سہل ہے جو نقاب اٹھے؟
شرمیلے ہیں، کیوں؟ حجاب اٹھے
کیونکر یہ کہیں زباں سے "اُف اُف"
ہم بزم میں آئیں بے تکلف

آجائیں تو شوخیٔ ادا سے
کیا آنکھ ملائیں گے حیا سے
یہ دن ہیں بہارِ زندگانی
بچپن کچھ ہے تو کچھ جوانی
گلچیں کہیں دسترس نہ پائے
ڈرتے ہیں بہار لٹ نہ جائے
کمسن نادان بھولے بھالے
جو چاہے وہ راہ پر لگا لے
جب اتنی سمجھ نہ ہو، کہا کیا؟
نہ فتنہ طرازیٔ ادا کیا؟
دشوار نہیں ہے ہاتھ آنا
بچپن کی سمجھ کا کیا ٹھکانا

چٹخارے نئے زباں کے ہیں
آفت ہے کہ دن اٹھان کے ہیں

ہو جاتی ہیں آرزوئیں بے باک
اس عمر میں سوجھتا نہیں خاک

ہر وقت ہجوم ولولوں کا
ہر وقت ہجوم حوصلوں کا

بھا جاتی ہے سیر گلشنوں کی
پروا نہیں رہتی رہزنوں کی

خود داریِ حسنِ محو انداز
سرمست مئے تبختر و ناز

زلفوں کا سنوارنا وہ دن بھر
ہر وقت نگاہ آئینے پر

عادت وہ گھڑی گھڑی بننا
ہر روز نئی نئی تمنا

پھر دیدہ دلیریاں اک آفت
بیباکیٔ آرزو قیامت

اچھا نہیں شام کا نکلنا
اچھا نہیں نام کا نکلنا

وہ ہے جو ذرا سنبھال لے جائے
جو دل کہے اس کو ٹال لے جائے

بنتا ہے شوق جی کا جنجال
کیا پھیر پھیرا ہے یہ سن وسال

ہم لاکھ نہ چاہیں وہ کریں ساز
سو طرح کے لوگ ہیں نظر باز

(ریاض خیر آبادی)

تشنہ لب ہوں مجھے پلا ساقی
مے کوثر کے جام لا ساقی
اثر بادۂ مے کے تام میں ہو
گردش چشم اور جام میں ہو
موج اٹھ کر نگاہِ اور سے بنے
چشم موسیٰ میں برق طور بنے
مردہ زندہ، مریض اچھا ہو
لبِ ساغر لبِ مسیحا ہو
پائے خم پر سرِ عقیدت ہو
سب کو دستِ سبو سے بیعت ہو
ہو ہر اک آج والہ مرشد کا
ظرف مے ہو پیالہ مرشد کا
طور تک یا حضور تک پہنچیں
نشّے کے پینگ دور تک پہنچیں
نشّے میں اونچے اڑ جائیں آج
پاکبازوں کو آج ہو معراج

ساقیٔ خوش جمال کی محفل
حال بنجائے قال کی محفل

لطف دے جائے قلقلِ مینا
وجد میں لائے قلقلِ مینا

جگرِ ارباب ذوق کا شق ہو
بزم میں وہ صدائے ہو حق ہو

جس کا مشتاق ایک عالم ہے
محفلِ پاک و غوث اعظم ہے

اس کو پہنچے کیا کوئی محفل
نور کے جام نور کی محفل

ہر طرف سے نویدِ رخصتِ ہوش
نورِ محفل سے حسنِ جلوہ فروش

دلِ عاشق کے داغ روشن ہیں
نئے کیسے چراغ روشن ہیں

شمع افسردہ نالۂ دل ہیں
آتشیں آہیں شمعِ محفل ہیں

(دریاؔ غنی خیرآبادی)

یہ کس نے کھٹکھٹایا آج مے خانہ کا دروازہ
ہر اک میکش یکایک بے پئے برہم اٹھا ساقی

یہ کیا مے کے بدلے خون چھلکا تیرے شیشے سے
یہ کیسا ساز سے اک نالۂ ماتم اٹھا ساقی

ہوائے زہر آگیں چل اٹھی شاید گلستاں میں
یہ پیمانے الٹ ساقی یہ جام جم اٹھا ساقی

اگر ممکن ہو تو بھی آج رنگین جام کے بدلے
لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی

(جاں نثار اختر)

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
ارم بن گیا دامنِ کہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن!
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام

سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز

کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز

وہ مے جس سے روشن ضمیرِ حیات

وہ مے جس سے ہے مستیٔ کائنات

وہ مے جس سے ہے سوز و سازِ ازل

وہ مے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے

لڑا دے ممولے کو شہباز سے

زمانے کے انداز بدلے گئے

نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ

کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ

پرانی سیاست گری خوار ہے

زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے
دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم
تجلّی کا پھر منتظر ہے کلیم
مسلماں ہے توحید میں گرمجوش
مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش
تمدّن تصوف شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امّت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم میں خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے!
شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا
مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخِ ملّت ترے نم سے ہے
یقیں اس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰ سوزِ صدیق دے

جگر سے وہی تیر پھر پار کر
تمنّا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اس کو سیّار کر
بتا مجھکو اسرارِ مرگِ حیات
کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
مری دیدۂ ترکی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوتِ انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری
امیدیں مری جستجوئیں مری

مری فطرت آئینۂ روزگار
غزالانِ افکار کا مرغزار
مرا دل مری رزم گاہِ حیات
گمانوں کا لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے
دما دم رواں ہے یمِ زندگی
ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود
گراں اگرچہ صحبتِ آب و گل
خوش آئی اسے محنتِ آب و گل
یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر

یہ عالم یہ بت خانہ شش جہات
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عین محفل میں خلوت نشیں

چمک اس کی بجلی میں تاروں میں ہے
یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے

اسی کے بیاباں اسی کے ببول
اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول

کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور
کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور

کہیں جرہ شاہین سیماب رنگ
لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ

کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور
فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو رازِ زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لئے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے
ہوا جب اسے سامنا موت کا
کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا

اثر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کے گھات میں
مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج
اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اور اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات
بڑی تیز جولاں بڑی زود رس!
ازل سے ابد تک، رم یک نفس
زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے
یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے!
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند

سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک

من و تو میں پیدا من و تو سے پاک

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے

نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی

ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں

پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں

سفر اس کا انجام و آغاز ہے

یہی اس کی تقویم کا راز ہے

کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں

یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے

نشیب و فراز و پس و پیش سے

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر

ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے

فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

(اقبالؔ)

نیا دن ہے، ارے ساقی نیا سال
پرانا بادہ کش ہوں دے نیا مال
اچھوتی مے اچھوتے جام کی ہو
ارے نئے سال! کچھ ہو، کام کی ہو
وہ کھل کر پاس میرے سو بھی آئے
پرانی بھی لباسِ نو میں آئے
جو خواہش ہے تو خواہش ہو اسی کی
کہ وہ جھوٹی نہ ہو ساقی کسی کی
نہ کوئی داغ ہو دامن پر اس کے
تصدق جام ہو جوبن پر اس کے
نہ کچھ ہو ہستیِ معشوقِ نوخیز
بھری ہو مستیِ معشوقِ نوخیز
ارے ساقی! وہ تیرے جام کی ہو
ارے ساقی! وہ میرے کام کی ہو

کسی سے بھی نہ اس نے بات کی ہو
دلہن گویا وہ پہلی رات کی ہو
رہی ہو سایۂ پیرِ مغاں میں
پلی ہو سایۂ پیرِ مغاں میں
حسیں ہو، نازنیں ہو، نوجواں ہو
چراغ خانۂ پیرِ مغاں ہو
وہ نازک کچھ نزاکت کی نہ ہو حد
جو گل سی شکل ہو بوٹا سا قد
قدم آنکھوں سے ہر ساغر لگائے
جو دیکھے سرو مینا سر جھکائے
بدن میں ہو لباسِ ارغوانی
پھٹی پڑتی ہو اس پر نوجوانی
پری اُڑ کر سیکھے طاؤس تن کر
وہ چلنے میں سکھے طاؤس بن کر
بنے ہر موجِ مے چوٹی کا موباف
کہے ہر ایک ہے چوٹی کا موباف

ہوا دامن اگر چھو لے لڑے وہ
ادائے مست سے جھک جھک پڑے وہ
اسے خلوت میں پاکر دل میں رکھ لوں
نگاہوں سے اٹھا کر دل میں رکھ لوں
کرشموں میں بھری ہو دلربائی!
مزا دے جیسے کوئی کھیلی کھائی
مرے گھر آنے والی جانے والی
ارے ساقی وہی میخانے والی
اسی کو تو مرے قابو میں دیدے
مرے دل کو مرے پہلو میں دیدے

(ریاض خیرآبادی)

ترے ہوتے ہوئے غم آشوبِ جہاں اے ساقی
ہے تری غیرتِ خوددار کہاں اے ساقی
جس کی شیرینیٔ گفتار پہ دل کھنچتا تھا
کھنچنے والی ہے دہن سے وہ زباں اے ساقی
جبر کی حد ہے کہ مجبورِ محبت کے لئے
تنگ ہے عرصۂ فریاد و فغاں اے ساقی
پھر کسی آتشِ خاموش کا ٹوٹے گا سکوت
بطنِ گیتی سے پھر اٹھتا ہے دھواں اے ساقی
صاف ظاہر ہے کہ انجامِ چمن کیا ہوگا
ہے نسیمِ سحری شعلہ فشاں اے ساقی
ذکرِ گلشن سے ہیں خود اہلِ گلستاں بیزار
اور کس کو کہتے ہیں خزاں اے ساقی

میکدہ جن سے تھا آباد وہ رندانِ کہن
ہیں فسردہ نظر و درد بجاں اے ساقی
نسبت کم ظرف نہیں ہے ساغر صہبائے جدید
چشم احساس ہے حیرت نگراں اے ساقی
اپنے مٹنے کی ہمیں کچھ نہیں پروا لیکن
تم نے سوچا ہے کچھ اپنا بھی زیاں اے ساقی
تو ہے انساں کشی ماحصل دیر و حرم
بند کر شورشِ ناقوس و اذاں اے ساقی
بخشدے جو دلِ انور کو حیاتِ ابدی
لا وہی بادۂ گلرنگ و جواں اے ساقی

(انور صابری)

اِدھر آ اِدھر ساقئ بدحواس
ذرا بیٹھ جا اپنے رندوں کے پاس
یہ کیسی نگاہیں ہیں کھوئی ہوئی
یہ کیا ہے کہ محفل ہے سوئی ہوئی
ڈھلکتا وہ شانے سے آنچل نہیں
وہ شوخی نہیں ہے وہ چھل بل نہیں
نہ آنکھوں میں لہرا ہوا وہ سرور
کہ ہم بے پیئے جس سے ہوجائیں چور
نہ وہ مست رنگیں لچکتا خرام
کہ موجوں پہ لہرا کے بہتا ہو جام
نہ چشم عنائت نہ حسنِ عتاب
تھکی سی ادا مضمحل سا شباب
وہ طوفاں نہیں وہ روانی نہیں
کہ جیسے جوانی، جوانی نہیں

بجھا سا تبسم ہے اور کچھ نہیں
دبا سا تلاطم ہے، اور کچھ نہیں
یہ آخر پریشاں خیالی ہے کیا
ترا میکدہ آج خالی ہے کیا؟
نہیں یہ تو پھر ہائے اندھیر ہے
اٹھا ساقیا جام کیا دیر ہے
کہاں فرصتِ عیش پاتے ہیں ہم
قسم ہے کہاں روز آتے ہیں ہم
چلے ساقیا دورِ ساغر چلے
کہ مینا کو بڑھ کر لگا لیں گلے
ترے رند کب رہیں تشنہ کام
بڑھا اپنے ہاتھوں سے گلرنگ جام

یہ کیا سچ مچ ہی ٹھنڈے ہیں ہات
بتا تو ہمیں ساقیا دل کی بات
اڑا تیرے چہرے کا کیوں رنگ ہے
ارے تجھکو بھی خطرۂ جنگ ہے

کبھی کر تو ہم سے لڑکانے کی بات
بتا دیں، تجھے ہم زمانے کی بات
جہاں میں غلامی کا عنوان ہے جنگ
سراسر ہلاکت کا سامان ہے جنگ
لئے برق و فولاد و آہن کا زور
مچاتی ہوئی قتل و غارت کا شور
دہکتا یہ شعلہ دھکتی یہ آگ
جلا جس میں دنیا کا صدیوں سہاگ
لگائی ہے اس نے گلستاں میں آگ
لگائی ہے اس نے بیاباں میں آگ
جلائی ہے بستی جلائے ہیں گھر
جلائے ہیں دیوان و دیوار و در
جلائی ہیں فصلیں، جلائے ہیں کھیت
لہو میں نہائی ہے ساحل کی ریت
رچایا ہے پر ہول خونیں طلسم
درختوں پہ بالوں سے ٹانگے ہیں جسم

اٹھاتے ہیں شعلے گراتے ہیں بم
مٹایا ہے انسانیت کا بھرم
مکانوں کی آہٹیں، مکینوں کی چیخ
فلک تک گئی ہے زمینوں کی چیخ
یہ ناگن سے پھن اٹھائے ہوئے
یہ ڈائن کلیجے چبائے ہوئے
یہ سرمایہ داروں کی پالی ہوئی
سدا شہریاروں کی پالی ہوئی
بھیانک ہنسی کھوکھلی سی نظر
کھڑی سرد لاشوں کے انبار پر
جو بس ہو تو یہ دشمنِ نام و ننگ
یہ محبوبۂ پیرِ زالِ فرنگ
سارے زمانے کا نام و نشاں
بنا دے زمیں کو فلک کا دھواں
مگر زندگی اک عمرِ دوام

نہ ہو میکدہ ساقی فکر مند
کہ ہے امن کا آج پرچم بلند
خوشا زندگی کی بشارت کے لئے
کروڑوں دلوں کی امانت کے لئے
یہ گیتی کے شانے پہ جاگا نشان
یہ پرچم ہے اعلانِ امن و اماں
یہ ظلِّ کرم، سایۂ عاطفت
یہ دیباچۂ عدل و انسانیت
نگارِ فضا، دلبرِ کائنات
نگہبانِ ہستی، امینِ حیات
سلامِ محبت، پیامِ قرار
ضمیرِ گلستاں، سفیرِ بہار
کفیلِ جہاں، ضامنِ آبرو
زمانے کے دل کی جواں آرزو
یہ مظلوم انسانیت کی نجات
یہ اڑتی ہوئی موجِ آبِ حیات

ہر اک شورِ دستِ آج بے سود ہے
کہ اب امن دنیا کا مقصود ہے
رہے امن ہر آدمی کے لئے
رہے امن محنت کشی کے لئے
رہے امن ہر انجمن کے لئے
رہے امن تہذیب و فن کے لئے
رہے امن علم و ہنر کے لئے
رہے امن قلب و نظر کے لئے
رہے امن ہر رنگ و بو کے لئے
رہے امن جام و سبو کے لئے
رہے امن جہدِ بقا کے لئے
رہے امن ہر ارتقا کے لئے
رہے امن سارے جہاں کے لئے
رہے امن ہندوستاں کے لئے

○

پلا ساقیا بادۂ خانہ ساز
کہ ہندوستاں پہ رہے ہم کو ناز
محبت ہے خاک وطن سے ہمیں
محبت ہے اپنے چمن سے ہمیں
ہمیں اپنی صبحوں سے شاموں سے پیار
ہمیں اپنے شہر کے ناموں سے پیار
ہمیں پیارا اپنے ہر اک گاؤں سے
گھنے برگدوں کی گھنی چھاؤں سے
اٹھائے جو کوئی نظر کیا مجال
ترے رندلیں بڑھ کے آنکھیں نکال
سلامت رہیں اپنے دشت ودمن
رہے گنگناتا ہمارا گگن
نگاہیں ہمالہ کی اونچی رہیں
سدا چاند تاروں کو چھوتی رہیں
نہاتا رہے نرم کرنوں میں تاج
رہے ساقیا ملت محبت کی لاج

اجنتا کے بت رقص کرتے رہیں
حسین غار تاروں سے بھرتے رہیں
رہیں مسکراتی حسین وادیاں
رہیں شاد جنگل کی شہزادیاں
فضا روشنی میں نہاتی رہے
ہماری زمیں جگمگاتی رہے
سلامت رہے انکھڑیوں کی حیا
سلامت رہے گھونگھٹوں کی ادا
سلامت وفاؤں کے ارماں رہیں
سلامت محبت کے پیماں رہیں
لجانا رہے مسکرانا رہے
منانا رہے روٹھ جانا رہے
محبت کے نغمے ابلتے رہیں
جواں سال نغموں میں ڈھلتے رہیں
سدا زندگانی غزل خواں رہے
زمانے میں غالب کا دیواں رہے

فضاؤں میں چھڑتے رہیں یہ ستار
سدا جھنجھناتے رہیں دل کے یہ تار

مچلتی رہے مست مینا کی مے
بدلتی رہے سات رنگوں کی مے

دہکتا رہے اپنے دیپک کا راگ
کلیجوں میں لگتی رہے نرم آگ

رہے گونجتی گھنگھروؤں کی کھنک
دفوں کی صدا ڈھولکوں کی گمک

رہے ساقیا بادہ خواروں کی خیر
رہے ساقیا تیرے پیاروں کی خیر

رہے خیر ساقی ترے ہات کی
رہے خیر ساقی ہر اک بات کی

ابھرتا رہے زندگانی کا جوش
رہے تیرے رندوں کو دنیا کا ہوش

خوشا میکدے کی بہاریں رہیں
مچلتی یہ مے کی پھواریں رہیں

صراحی سے ساغر ہے متصل
نہ ٹوٹے کبھی تیرے شیشوں کا دل

سلامت ترا جام و مینا رہے
بڑے لطف کے ساتھ پینا رہے

اٹھا جام! ہاں دور ساقی رہے
جہاں میں سدا امن باقی رہے

(جاں نثار اختر)

تری آواز حق کا آخری پیغام ہے ساقیؐ
کہ تیری ذات پر ہی دین کا اتمام ہے ساقیؐ
شبِ معراج تو اس بارگہِ خاص میں پہنچا
جہاں پر ختم دورِ گردشِ ایام ہے ساقیؐ
ترے دورِ رسالت کا تعین ہو نہیں سکتا
ازل آغاز ہے ساقیؐ ابد انجام ہے ساقیؐ
جسے آنا ہو آئے خواہ شرقی ہو کہ غربی ہو
ترے میخانے میں شورِ صلائے عام ہے ساقیؐ
مکان و لامکاں میں کس قدر ہے فصل کیا کہیے
مگر تجھ کو بقدرِ وسعتِ یک گام ہے ساقیؐ
تری ہر بات پر ایمان لانا عین فطرت ہے
کہ تیرا نطق تو پروردۂ الہام ہے ساقیؐ
"حنین و بدر" میں وہ تیری شانِ لشکر آرائی
جہانِ کفر اب تک لرزہ براندام ہے ساقیؐ

جہانِ آب و گِل ہو، قبر ہو برزخ ہو محشر ہو
مجھے اوروں سے کیا مطلب تجھی سے کام ہے ساقی

وہ محفل جس کی آبِ نیغ سے ہوتی تھی سیرابی
وہاں اب دورِ جامِ بادۂ گلفام ہے ساقی

زمانہ آگیا تہذیبِ افرنگی کے پھندوں میں
کہ ہم رنگِ زمیں پھیلا ہوا اک دام ہے ساقی

خدا والوں کی دنیا میں اندھیرا ہوتا جاتا ہے
جہاں کل صبحِ رقصاں تھی وہاں اب شام ہے ساقی

مگر اس پر بھی باطل حق پہ غالب آ نہیں سکتا
خدا کے دشمنوں کا یہ خیالِ خام ہے ساقی

مبارک اہلِ دنیا کو زر و دولت کی ارزانی
مگر ماہرؔ کو بس کافی ترا اک نام ہے ساقی

(ماہر القادری)

زمانہ کا رسالت پر تری ایمان ہے ساقی
مگر الفت تری ایمان کی بھی جان ہے ساقی

ترے کردار پر دشمن بھی انگلی رکھ نہیں سکتا
ترا اخلاق تو قرآن ہی قرآن ہے ساقی

مشیت بھی تری مرضی کے تیور دیکھ لیتی ہے
یہ اقرارِ ابدیت یہ تیری شان ہے ساقی

تجھے جس نے نہ پایا وہ خدا کو پا نہیں سکتا
کہ تیری معرفت اللہ کی پہچان ہے ساقی

ترے آتے ہی انانیتِ کبریٰ ابھر آئی
زمانہ پر ترا احسان ہی احسان ہے ساقی

کسی صورت ترے دربارِ اقدس تک پہنچ جاؤں
مجھے دشوار ہے تیرے لئے آسان ہے ساقی

گنہگاروں کی نظریں تیری جانب اٹھ رہی ہونگی
سرِ محشر یہی تیری بھی پہچان ہے ساقی

کبھی اے کاش! سوتے میں ترا دیدار ہو جائے

یہی ارمان تھا ساقی! یہی ارمان ہے ساقی

نہ وہ ایمان کی گرمی نہ وہ تنظیم امت کی

نہ وہ مصر و شام پہلے کا نہ وہ ایران ہے ساقی

خلافت دے کے بھیجا تھا جسے حق نے زمانے میں

وہی انسان اب متغیر زدہ انسان ہے ساقی

مری آنکھوں نے ہیں دیکھی عجم کی بزم آرائیاں

غضب ہے محفلِ بغداد بھی ویران ہے ساقی

نگاہ و دل پر قبضہ کر لیا ہے عہدِ حاضر نے

کوئی منکر، کوئی باغی، کوئی حیران ہے ساقی

جہاں میں انتشار و برہمی کا دور دورہ ہے

ادھر طغیان ہے ساقی، ادھر طوفان ہے ساقی

بتوں کی طرح قبروں کی طرف پیشانیاں خم ہیں

خدا کے ماننے والوں کا یہ ایمان ہے ساقی

خداوندانِ دولت کی خدائی آہ! کیا کہیے

کوئی فرعون ہے ساقی کوئی ہامان ہے ساقی

مسلماں تا مسلمانوں کی صف میں آئے جاتے ہیں

کہ اب ایمان ایک ٹوٹا ہوا ایمان ہے ساقی

جو ڈوبے ہیں نکل آئیں جو گرتے ہیں سنبھل جائیں

توجّہ سے تری اس کا ابھی امکان ہے ساقی

تری رحمت بالآخر رحم فرمائے گی امت پر

یہی اک چیز ہے جس سے کہ اطمینان ہے ساقی

زہے قسمت کہ میں منجملۂ اہلِ محبت ہوں

ترے اصحابؓ کی الفت مرا ایمان ہے ساقی

کوئی صدیقِ اکبرؓ ہے، کوئی فاروقِ اعظمؓ ہے

کوئی حیدرؓ ہے کوئی جامعِ قرآن ہے ساقی

مرا مسلک نہیں ایمان کو ڈر کر چھپا لینا

مرا ایمان تو اعلان ہی اعلان ہے ساقی

(ماہر القادری)

نگاہِ لطف و کرم کا جب سے بدل گیا ہے نظام ساقی
یہ جام و مینا سبو و ساغر ہوئے ہیں مجھ پہ حرام ساقی

اُٹھا ہے ابرِ سیاہ لے کر جو میکشی کا پیام ساقی
ہر اک زاہد نے زہد توڑا کیا ترا احترام ساقی

فضا پہ ابرِ بہار بن کر جب ان کے شانوں پہ زلف بکھری
تو میں یہ سمجھا کہ دے رہی ہے یہ میکشی کا پیام ساقی

حسین جوانی حسین تصور حسین تبسم حسین لمحے
ترے اشاروں پہ چل رہا ہے نظام عالم تمام ساقی

ترے اشاروں پر رندِ مشرب جھکا رہے ہیں جبینِ ہستی
بنا لیا ہے تری تری چشمِ میگوں کو سب نے اپنا امام ساقی

کلی کلی مسکرا رہی ہے چمن چمن لہلہا رہا ہے
بہارِ دیدِ بہارِ گلشن ہے اس قدر اہتمام ساقی

(بہار الہ آبادی)

چمن پاکٹ سیریز

چمن پاکٹ سیریز جو ابتک شائع ہو چکی ہیں

۱۔	مظلوم قاتل	جاسوسی ناول	عارف مارہروی
۲۔	زمانہ کیا کہیگا	رومانی ناول	راحلہ بانو
۳۔	روحِ غزل	غزلوں کا مجموعہ	مرتبہ انور کمال حسینی
۴۔	انوکھی دشمنی	جاسوسی ناول	عارف مارہروی
۵۔	آندھیاں	رومانی ناول	انیس مرزا
۶۔	ساقی نامے	شعر و شاعری	مرتبہ انور کمال حسینی